Sharjeel Ahmed
تعلیم و تربیت
اطفال پاکستان نمبر
مارچ
1997
میرے آیندہ کے معمار
پہلی قسط
قائدِ اعظم کلاسک
تیسری قسط
رابن سن کروسو
ROBINSON CRUSOE

56 واں سال بارہواں شمارہ

پاکستان میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا

تعلیم و تربیت

بچوں کا محبوب رسالہ

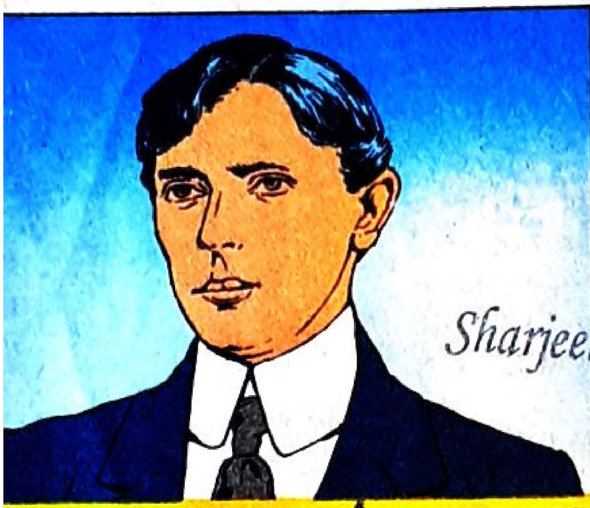

اطفالِ پاکستان نمبر

کی اشاعت کے موقع پر

خوشخبری

قائدِ اعظمؒ کلاسک کا آغاز

Sharjeel Ahmed

بسم اللہ الرحمن الرحیم

السلام علیکم و رحمتہ اللہ!

مارچ کا مہینا اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ آج سے 57 سال پہلے (1940ء میں) اسی مہینے کی 23 تاریخ کو لاہور میں مسلم لیگ کا تاریخی اجلاس ہوا۔ جس کی صدارت قائداعظمؒ نے فرمائی۔ اس اجلاس میں ہندوستانی مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن کا مطالبہ کیا گیا۔ جس کے نتیجے میں آج سے 50 سال پہلے (1947ء میں) پاکستان بن گیا۔ یہ سال پاکستان کی گولڈن جوبلی کا سال ہے۔ اس سال ہمیں اپنے پیارے دیس کو عظیم سے عظیم تر بنانے کا عہد کرنا چاہیے۔ بچے اپنے وطن عزیز کو عظیم سے عظیم تر کیسے بنائیں؟ اس شمارے کو آپ اگر غور سے پڑھیں تو اس سوال کا جواب مل جائے گا۔

اللہ سے دعا ہے کہ وہ اس پاک وطن کو سدا شاد و آباد رکھے اور ہمیں توفیق دے کہ ہم اپنے کردار و عمل سے اسے صحیح معنوں میں پاکستان بنائیں۔ یعنی پاک اور صاف لوگوں کی سرزمین۔ آمین!

جنوری سے سلسلہ وار ناول ' نام ور لوگ ' کھیلوں کی دنیا ' آیئے دوست بنائیں ' بلا عنوان اور ہونہار مصور ' سلسلے شروع کیے گئے ہیں۔ رنگین صفحات پہلے سے دگنے کر دیئے ہیں۔ اور اب مارچ سے اسی قیمت میں صفحات بڑھائے جا رہے ہیں۔ نیز قائداعظمؒ کلاسک بھی شروع کیا جا رہا ہے۔ یہ سب آپ کی تجویزوں پر عمل کرتے ہوئے کیا گیا ہے کیوں کہ ہم تعلیم و تربیت کو بنانے ' سنوارنے میں آپ ہی کی پسند اور ناپسند کو مد نظر رکھتے ہیں۔ امید ہے آیندہ بھی آپ ہمیں اچھی اچھی تجویزیں اور مشورے دیتے رہیں گے اور ہماری یہ کوشش رہے گی کہ اگلا شمارہ پچھلے سے بھی زیادہ دل چسپ اور حسین ہو۔

اس شمارے میں

اداریہ		1
حمد (نظم)	ضیاء الحسن ضیا	2
پاکستان کا سپوت (کہانی)	سید نظر زیدی	3
چوتھائی روٹی (کہانی)	اشتیاق احمد	9
واپسی (کہانی)	نذیر انبالوی	10
ایک دیوانہ (شخصیت)	ڈاکٹر رضوان ثاقب	16
تحریک پاکستان میں مسلمان بچوں کا کردار	ڈاکٹر عبدالرؤف	20
بچوں کے نام... (تاثرات اور پیغامات)	عرفانہ یاسمین	21
آیئے مسکرائیں (لطائف)		23
سردار عبدالرب نشترؒ (نامور لوگ)	الیاس نظامی	24
بوجھ ' ایک پہیلی بوجھو (منظوم پہیلی)	جاوید امتیازی	26
آپ کا خط ملا		27
بالکل سچی (کہانی)	نجمہ معراج	29
داؤدی علمی آزمائش		35
کھیلوں کی دنیا	سید شوکت اعجاز	36
تحفہ (کہانی)	ف۔ عزیز	38
مجھے پاکستان جانا ہے (کہانی)	عبیدہ ملک	44
منصف موت تھی (کہانی)	سلیم خان گمی	49
پیارا دیس (نظم)	ضیغم حیدی	57
آیئے دوست بنائیں (قلمی دوستی)		58
آپ بھی لکھیے		59
بلا عنوان (کارٹون)		64
ہونہار مصور		65
رابن سن کروسو (تیسری قسط)	قمر نقوی	66
نام ہے میرا پاکستان (نظم)	حفیظ الرحمان احسن	69
قائداعظمؒ کلاسک		70

کل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

چیف ایڈیٹر عبدالسلام

ایڈیٹر، پبلشر ظہیر سلام

مشیر سعید لخت

سینئر اسسٹنٹ ایڈیٹر ڈاکٹر رضوان ثاقب

خصوصی مشیر محمود حسن رومی

اسسٹنٹ ایڈیٹر/ ڈیزائننگ سید شوکت اعجاز

سرکولیشن اسسٹنٹ محمد بشیر راہی

مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور

پرنٹر عبدالسلام

سرکولیشن اور اکاؤنٹس

60- شاہراہ قائداعظمؒ لاہور

سالانہ قیمت

پاکستان میں (صرف رجسٹری کے ساتھ)

=/345 روپے

مشرق وسطیٰ، افریقہ (ہوائی ڈاک سے)

=/690 روپے

یورپ ہوائی ڈاک سے

=/770 روپے

امریکہ/ مشرق بعید (ہوائی ڈاک سے)

=/890 روپے

قیمت فی پرچہ =/15 روپے

مارچ 1997ء

آیندہ کے معمار

پتا: ماہنامہ تعلیم و تربیت 32- شاہراہ بن بادیس لاہور فون: 6361309-6361310 6278815-6278816

عہد

ضیاء الحسن ضیا

وطن کو ہم سنواریں گے
چمن کو ہم نکھاریں گے

وطن ہم نے بنایا ہے
جو ہم کو جاں سے پیارا ہے
وطن کی آن کی خاطر
ہمیں مرنا گوارا ہے

وطن کو ہم سنواریں گے
چمن کو ہم نکھاریں گے

ہمیں اللہ دے ہمت
وطن کی ہم کریں خدمت
بنا دیں گلستاں اس کو
کریں دن رات ہم محنت

وطن کو ہم سنواریں گے
چمن کو ہم نکھاریں گے

وطن کی آن ہم سے ہے
وطن کی جان ہم سے ہے
حفاظت فرض ہے اس کی
وطن کی شان ہم سے ہے

وطن کو ہم سنواریں گے

پاکستان کا سپوت

Sharjeel Ahmed

سید نظر زیدی

بوڑھی خاتون بان سے بُنے ہوئے پلنگ پر تکیے کے سہارے اس شان سے بیٹھی تھی جیسے کسی مُلک کی مَلکہ شاہی تخت پر بیٹھی ہو۔ پلنگ کے قریب کُرسی پر اس کا بیٹا بیٹھا تھا اور ذرا فاصلے پر تین خوب صورت گول مٹول بچّے اپنے کھلونوں سے کھیل رہے تھے۔

یہ گاؤں کے ایک سادہ، لیکن صاف ستھرے گھر کا کشادہ صحن تھا جس میں امرود، آم اور جامن کے تین درخت اور پھولوں کے پودے بہار دکھا رہے تھے۔ درختوں پر ننھّی مُنّی چڑیاں چوں چوں کے گیت گاتی پُھدکتی پھر رہی تھیں۔ کبھی کبھی وہ شور مچاتی پھولوں کے پودوں پر بھی آ بیٹھتی تھیں۔

اس کچّے گھر کی ہر چیز بہت پیاری اور پُرسکون لگ رہی تھی، لیکن خاتون کے ادھیڑ عمر بیٹے میاں آصف علی کے چہرے پر اُداسی چھائی ہوئی تھی۔

خاتون کچھ دیر خاموش نظروں سے اپنے بیٹے کی طرف دیکھتی رہی، پھر پیار بھری آواز میں بولی "بیٹے تمہارے چچا کے گھر کی بربادی کا خود ہمیں بھی بہت رنج ہے۔ لیکن کیا کیا جا سکتا ہے۔ یہ تو اصل میں ان کے غلط

کاموں ہی کا نتیجہ ہے۔ اُنھوں نے جیسے بیج بوئے تھے ویسی ہی فصل تیار ہوئی"۔

"امّی جان، یہ آپ کیا کہ رہی ہیں؟" میاں آصف نے چونک کر اپنی ماں کی طرف دیکھا۔

"ٹھیک کہ رہی ہوں بیٹے، اُنھوں نے جیسے کام کئے تھے ویسا نتیجہ بھگتا" خاتون نے کہا۔

"یہ آپ کیا فرما رہی ہیں۔ امّی جان، خدا کے فضل سے چچا جان تو مُلک کے بہت معزز لوگوں میں گنے جاتے تھے، ماشاءاللہ بڑی جائیداد کے مالک تھے۔ میرے نزدیک تو اُن کی زندگی بہت شان دار تھی۔ میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ کاش ابّا جان بھی ان کی طرح کوشش کرتے۔ کاش ہمارے پاس بھی اتنی ہی دولت ہوتی جتنی ان کے پاس ہے"۔

"اس کی وجہ یہ ہے بیٹے کہ تم اصلی عزّت اور نقلی عزت کے فرق پر غور نہیں کر رہے۔ سچی شان اور جھوٹی شان کے فرق کو نہیں سمجھ رہے۔ اللہ اُنھیں معاف کرے، اُنھوں نے تو روپے پیسے کو خدا سمجھ لیا تھا اور اِسے حاصل کرنے کے لئے بُرے درجے کے لالچی اور بے رحم بن گئے تھے۔ اس کے نتیجے میں اس بُرے انجام کو پہنچے۔ میرے نزدیک تو اُنھوں نے ایک طرح خود کشی کی جو بہت ہی بری موت ہے"۔

"نہیں امّی جان، نہیں، ہم ان کی موت کو خود کشی نہیں کہ سکتے۔ دِل کا دورہ تو اس زمانے کی عام بیماری ہے اور ان کا انتقال اس بیماری سے ہوا"۔

"بہرحال جو کچھ بھی ہوا، جو لوگ اس دنیا سے چلے جائیں ان کے اچھّے بُرے کاموں پر بحث نہیں کرنی چاہئے۔ میں نے تو چند باتیں اِس لیے کہ دیں کہ تم اچھائی بُرائی کا فرق سمجھ لو"۔

"شکریہ امّی جان، اگر چچا جان کی زندگی کا کوئی خاص راز ہے تو مجھے ضرور بتایئے۔ آدمی اچھائی برائی کا فرق نہ سمجھے تو بہت سی مصیبتوں میں پھنس جاتا ہے۔ اب ضروری لگ رہا ہے کہ آپ یہ بات پُوری طرح سمجھائیں"۔

بیٹے کی یہ بات سن کر خاتون نے کہا "مجھے یہ کل کی بات لگ رہی ہے کہ 1947ء میں ہم سب ایک قافلے کے ساتھ پاکستان آئے تھے۔ اس وقت میری عمر پندرہ برس تھی۔ کچھ دن مہاجر کیمپوں میں مصیبتیں برداشت کرنے کے بعد تمہارے ابّا نے اس گاؤں میں یہ گھر اور تھوڑی سی زمین الاٹ کرائی۔ گھر بس نام ہی کا گھر تھا۔ شاید ہم جیسے کسی غریب ہندو یا سکھ کا ہوگا جو بھارت چلا گیا تھا۔ تمہارے چچا نے زیادہ بھاگ دوڑ کی اور گاؤں میں زمین اور مکان الاٹ کرانے کے علاوہ لاہور میں بھی ایک مکان اور دُکان پر قبضہ کر لیا"۔

"ابّا جان نے ایسی کوشش کیوں نہ کی؟" بیٹے نے سوال کیا۔

"اس لئے کہ تمہارے ابّا اور چچا کی طبیعتوں میں بہت فرق تھا۔ تمہارے ابّا حق اور انصاف کو ماننے والے پکّے سچے مسلمان تھے، ان کا خیال تھا کہ اپنے اس نئے وطن میں ہم مال دولت حاصل کرنے نہیں آئے۔ بلکہ اپنے دین ایمان کی حفاظت کرنے آئے ہیں۔ ہم اسے ایک ایسا ملک بنائیں گے جس سے اسلام اور مسلمانوں کی شان بڑھے گی"۔

"اور چچا جان؟" بیٹے نے ایک اور سوال کیا۔

"بیٹے، تمہارے چچا کا حال شروع ہی سے کچھ اور طرح کا تھا۔ نام اُن کا مسلمانوں جیسا ضرور تھا، لیکن کام ایک بھی مسلمانوں جیسا نہ کرتے تھے۔ نماز روزے کی پابندی تک نہ کرتے تھے۔ اُن کی اور تمہارے ابّا کی زندگیوں میں اتنا فرق تھا کہ دونوں سگے بھائی لگتے ہی نہ تھے"۔

"اِسی لیے وہ ابّا جی کے ساتھ نہ رہے"۔

"تمہارے ابّا جی کے ساتھ کس طرح رہتے بیٹے، وہ تو یہاں آتے ہی رئیسِ اعظم بننے کی فکر میں لگ گئے تھے، اس زمانے میں غلط سَلط ہاتھ مارنے کی گنجائش بھی

بہت تھی۔ رشوت اور سفارش کے ذریعے زیادہ سے زیادہ زمین اور بڑے سے بڑا مکان الاٹ کرایا جا سکتا تھا۔ ایسے ایسے لوگ کوٹھیوں اور بنگلوں کے مالک بن گئے جنہیں بجلی کا پنکھا چلانا اور بند کرنا نہ آتا تھا"۔

"اگر یہ حالت تھی تو ابّا جی کو بھی کوشش کرنی چاہئے تھی۔ کم سے کم اپنا حق تو لے لیتے۔ آپ ہی کہا کرتی ہیں امرتسر میں ہماری بہت بڑی حویلی، مکان اور زمین تھی؟"

"بیٹے، اُن کے خیالات ہی کچھ اور تھے۔ وہ تو ان لوگوں میں سے تھے جو لیتے کم اور دوسروں کو دیتے زیادہ ہیں۔ وہ ہجرت کر کے اس ملک کو بنانے اور سجانے سنوارنے کے لئے آئے تھے، انہوں نے یہی کیا۔ پہلے خود گارا مٹی ڈھو کر اس مکان کو رہنے کے قابل بنایا۔ اس کی چھتیں ٹھیک کیں۔ دیواروں اور دروازوں کی مرمّت کی اور پھر اسکول میں بچّوں کو پڑھانے لگے"۔

"انہیں خیال نہیں تھا تو آپ ہی کہہ سن کر کم سے کم اپنا حق لینے پر آمادہ کرتیں"۔

"بیٹے، اوّل تو اس زمانے میں مجھے ایسی باتوں کا خیال ہی نہ تھا۔ دوسرے اللہ کے خاص فضل سے میرے خیالات بھی تمہارے ابّا جی جیسے ہی تھے۔ میں بھی پاکستان کا مطلب کیا، لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ ہی کہتی تھی۔ ہماری نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ بس دونوں ہی اپنے اس نئے وطن کی تعمیر میں لگ گئے۔ تمہارے ابا جی کے ساتھ مل کر پہلے اس گھر کو سجایا سنوارا اور پھر پاس پڑوس کے بچّوں کو قرآن پڑھانے لگی۔ یہ اس گھر کے صحن میں جو درخت تم دیکھ رہے ہو یہ میں نے ہی لگائے تھے۔ بس ایسے ہی ننّھے ننّھے پودے لگا دیئے تھے۔ یقین بھی نہیں تھا کہ پروان چڑھیں گے، لیکن تم دیکھ رہے ہو اب یہ تناور درخت بن گئے ہیں۔ اِتنا پھل آتا ہے اِن پر"۔

"میں تو خیال کرتا ہوں امّی جان، آپ دونوں سے تھوڑی سی بھول ضرور ہوئی۔ اگر آپ دونوں بھی ذرا سی کوشش کر لیتے تو چچا جان کی طرح بڑی جائیداد کے مالک ہوتے۔ کار اور کوٹھی والے ہوتے"۔

"اور شاید ہمارا انجام بھی انہی جیسا ہوتا۔ میرا تو رواں رواں کانپ اٹھتا ہے جب اس طرف دھیان جاتا ہے کہ سب کچھ ہوتے کے باوجود ان کا گھرانا کس طرح تباہ ہو گیا۔ ایک بیٹا نشے کا عادی ہو کر ناکارہ ہو گیا ہے، دوسرا غبن کے کیس میں پکڑا گیا اور خود شاید اسی صدمے سے "آناً" فاناً" مر گئے"۔

"امی جان، یہ تو ایک اتفاقیہ بات ہے۔ ایسے حالات تو بہت نیک لوگوں کے بھی ہو جاتے ہیں"۔

"نہیں بیٹے نہیں، معلوم نہیں کیوں میرا دل تو یہی کہتا ہے کہ تمہارے چچا جان کو ان کے گناہوں کی سزا ملی ہے۔ ان کی اتنی بڑی جائیداد کا کوئی اصلی وارث بھی نہیں رہا۔ تمہاری چچی ضرور زندہ ہیں لیکن ان کی حالت مُردوں سے بری ہے، غم کی وجہ سے پاگل سی ہو گئی ہیں بے چاری۔ افسوس"۔

"امّی جان آپ کچھ بھی کہیے، لیکن میں تو یہی محسوس کرتا ہوں کہ ابّا جان نے اپنے ساتھ زیادتی کی۔ جب وہ آسانی سے بہت کچھ بنا سکتے تھے تو انہیں بے پروائی نہیں کرنی چاہئے تھی۔ آدمی اپنی زندگی میں کچھ بنا جاتا ہے تو اس کی نسلیں کھاتی ہیں"۔

"بیٹے کی یہ بات سن کر خاتون کچھ دیر اس کی طرف دیکھتی رہی، پھر رُک رُک کر بولی "بیٹے، تمہارے دِل میں ایسے خیالات اِس وجہ سے آ رہے ہیں کہ تم اُن جذبوں سے واقف نہیں ہو جن کی برکت سے یہ نیا مُلک حاصل ہوا تھا۔ بیٹے، اُس زمانے میں جن کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان تھا وہ یہی سوچ کر اس ملک میں آیا تھا کہ اِسے ایک نمونے کا اسلامی ملک بنائے گا۔ اِسے لوٹنے میں تو وہ لگ گئے تھے جن کے دل ایمان کے نور سے خالی تھے۔ کاش وہ اس مُلک میں نہ آتے اور جو پہلے سے یہاں تھے وہ یہاں نہ رہتے۔ ایسے ظالموں نے

اِس مُلک کو بھی لوٹ لیا اور خود بھی تباہ ہو گئے"۔

"چلیئے ایسے لوگوں کا جو حال ہوا سو ہوا' لیکن نیکی کا راستہ اپنانے والوں کے ہاتھ کیا آیا۔ اپنے آپ ہی کو دیکھئے' آج پچاس برس بعد بھی اس کچّے گھر میں بیٹھی ہیں اور آپ کا اکلوتا بیٹا اپنے باپ کی طرح گاؤں کے اسکول میں بچّوں کو پڑھا رہا ہے"۔

"آصف بیٹے!" خاتون کی آواز میں اَب کِسی قدر غُصّہ تھا۔ ذرا دیر رُک کر بولی "بیٹے' میں تو تمہاری یہ بات سن کر حیران ہو رہی ہوں۔ یوں لگ رہا ہے کہ تم بھی انہی لوگوں کی طرح سوچنے لگے ہو جنہوں نے اس مُلک کو لوٹا اور تمہارے چچا کی طرح خود کو برباد کیا ہے۔ میری بات غور سے سنو! جب تم پیدا ہوئے تھے تو میں نے یہ خیال کیا تھا کہ اس باغ میں جس کا نام پاکستان ہے ایک ایسا نیا پودا اُگا ہے جو اس کی رونق اور شان بڑھائے گا۔ پھر میں نے تمہاری پرورش اس طرح کی جس طرح ایک نازک پودے کی کی جاتی ہے"۔

"تو امّی جان' خدا کے فضل سے میں نے اپنے مُلک کی شان بڑھائی ہے۔ اس کی خِدمت کی ہے۔ آپ نے یہ کیوں خیال کر لیا کہ میں اس مُلک کو لوٹنے اور بدنام کرنے والوں جیسا بن گیا ہوں۔ یہ بات تو بس یونہی میری زبان پر آگئی تھی"۔

"اور میں کہتی ہوں یہ بات ایسی کڑوی اور ناپاک ہے کہ یونہی بھی تمہاری زبان پر نہ آنی چاہئے تھی۔ میرے بیٹے' جس چیز کو گناہ کہتے ہیں اور جو آخر کار انسان کو برباد کر دیتا ہے اس کی شروعات خیالات میں خرابی آ جانے ہی سے ہوتی ہے۔ جب انسان کے دماغ میں یہ خیال آ جاتا ہے کہ نیکی کے راستے پر چلنے والے گھاٹے میں رہتے ہیں۔ اصل کام یابی جُھوٹ بولنے اور دھوکے بازی کرنے سے ہوتی ہے تو پھر دِل میں ایسے کام کرنے کا شوق پیدا ہوتا ہے اور آدمی گناہوں کی دَلدَل میں دَھنستا چلا جاتا ہے۔ میرے پیارے بیٹے' سچّے دل سے توبہ کرو کہ ایسے بُرے خیالوں کو اپنے دماغ میں کبھی نہ گھُسنے دو گے"۔

آصف ہنستے ہوئے بولا "امّی جان' میں نے کہا تو ہے کہ میں ایسے لوگوں میں شامل نہیں ہو گیا ہوں جو اس مُلک کو لوٹ رہے ہیں۔ آپ کی دعاؤں کے صَدقے میں اپنے عزیز وَطن کی خدمت کر رہا ہوں اور یہی سمجھتا ہوں کہ ہماری ساری شان ہمارے اِس وطن کی وجہ سے ہے جو ہم نے بڑی قُربانیاں دے کر حاصل کیا تھا۔ بے شک آپ یہ کہیں کہ یہ کامیابیاں اُنہوں نے غلط راستے پر چل کر حاصل کیں' لیکن اس بات سے تو انکار نہیں کر سکتیں کہ وہ بہت امیر تھے اور سرکار دربار میں ان کی بہت عزّت کی جاتی تھی۔ اِدھر ہم ہیں کہ.....۔

"میرا مطلب یہ نہیں امّی جان۔ میں تو یہ کہ رہا تھا کہ جو آرام اور عزّت دوسرے لوگوں کو حاصل ہے ہم اس کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے۔ چلئے چچا جان کو جانے دیجئے۔ ان چودھری رحمت اللہ کو ہی دیکھئے۔ آپ ہی نے بتایا تھا اُمرتسر میں ہمارے پڑوسی تھے اور منیاری کی چھوٹی سی دُکان کرتے تھے' اب رئیسِ اعظم بنے بیٹھے ہیں اور ہمارے چچا کی طرح ان پر کسی طرح کی مصیبت بھی نہیں پڑی۔ کیسے ٹھَٹّے کٹتے ہیں۔ اولاد بھی خوب پھول پھل رہی ہے۔ خدا کا شکر ہے ہمیں کسی طرح کی تنگی نہیں۔ اچھا کھاتے اور اچھا پہنتے ہیں۔ لیکن ان جیسی حالت تو نہیں ہے ہماری"۔

خاتون سنبھل کر بیٹھ گئیں اور سمجھانے کے انداز میں بولیں "بیٹے' میں تمہاری اس بات کا جواب تو بعد میں دوں گی کہ عزّت اور آرام ہمیں زیادہ حاصل ہے یا چودھری رحمت اللہ اور اُن جیسے دوسرے لوگوں کو۔ پہلے ایک اور بات سمجھانا چاہتی ہوں اور وہ یہ ہے کہ آدمی اپنا نقصان اس طرح بھی کرتا ہے کہ وہ اسے نقصان نہیں سمجھتا۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ وہ نقصان اسے نظر ہی نہیں آتا' لیکن وہ ہوتا بہت بڑا نقصان ہی ہے اور چودھری رحمت اللہ اور تمہارے چچا جیسے کم عقل لوگ بُرائی کا

راستہ اختیار کر کے اپنا ایسا ہی نقصان کرتے ہیں۔ لُوٹ کھسوٹ کے شوق میں انھیں یہ بات یاد نہیں رہتی کہ ان کے گناہوں کی وجہ سے وہ مُلک کم زور ہو رہا ہے جس میں ہم سب آباد ہیں۔ یہ چوری ڈاکے' قتل کے واقعات' مہنگائی اور بے ایمانی' سب انہی کی وجہ سے ہے۔ بھاری قرضوں کا بوجھ بھی انہی کی کارستانیوں کی وجہ سے ہمارے کندھوں پر رکھا گیا ہے۔ یہی بات ایک مثال کے طور پر بیان کروں تو یوں کہوں گی کہ ہمارا وَطن پاکِستان ایک جہاز ہے جس میں ہم سب سوار ہیں' یہ جہاز اس صورت میں اچھّی حالت میں رہ سکتا ہے کہ جِتنے بھی لوگ اس میں سوار ہیں اس کی دیکھ بھال کریں۔ کوئی چیز ٹوٹ جائے تو فوراً" نئی لگا دیں۔ لیکن یہ نامراد' بے ایمان اس کی چیزوں کو خراب کر رہے ہیں۔ کوئی کیل نکال لیتا ہے' کوئی تختہ اکھاڑ دیتا ہے۔ کوئی رنگ روغن خراب کر رہا ہے۔ اور یہی وہ نقصان ہے جسے میں نے بہت بڑا نقصان کہا ہے اور جسے یہ بے ایمان نقصان مانتے ہی نہیں"۔

"بِالکُل ٹھیک امیّ جان' آپ کی یہ بات بِالکُل ٹھیک ہے۔ اگر خُدا نہ کرے پاکِستان کم زور ہو گیا تو ہم سبھی خطرے میں پڑ جائیں گے"۔

"پیارے بیٹے' کوئی مانے یا نہ مانے' لیکن غلط کام کرنے کی صورت ایسی ہوتی ہے جیسے کوئی کسی دیوار میں سے ایک اینٹ نکال لے۔ جِس طرح زیادہ اینٹیں نکل جانے سے دیوار گر جاتی ہے' اِسی طرح زیادہ گناہ کرنے والوں کے مُلک تباہ ہو جاتے ہیں"۔

"بِالکُل ٹھیک امیّ جان' بِالکُل ٹھیک' میں تو سچّے دِل سے اللہ کا شُکر ادا کرتا ہوں کہ آج تک کوئی ایسا کام نہیں کیا جس سے میرے پیارے وَطن کو کِسی طرح کا نُقصان پہنچتا یا اس کی شان کم ہوتی۔ آج ایک غلط خیال دماغ میں آ گھُسا تھا جِس کے لیے اللہ سے توبہ کرتا ہوں۔ آپ بھی دُعا کیجئے کہ اللہ میرا یہ گناہ معاف کر دے اور اس راستے پر چلائے جو آپ نے اور ابّا جی نے دکھایا ہے"۔

"خُدا کا شُکر ہے تمہاری سمجھ میں یہ بات آ گئی۔ اب سنو آرام اور عزّت کی بات' اور وہ یوں ہے کہ سچّا آرام اور سچی عزت آدمی کو نیکی کے راستے پر چلنے ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ ایک تو اسے اللہ پاک کی طرف سے امداد ملتی رہتی ہے' دوسرے اِس خیال سے اُس کا دل مطمئن رہتا ہے کہ میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا' بَلکہ ایسے کام کئے ہیں جِن سے اللہ کے بندوں کو راحت پُہنچی ہے۔ اِس کے مقابلے میں بُرائی کی رَاہ پر چلنے والے اللہ کی رحمت سے بھی محروم رہتے ہیں اور یہ خوف بھی آگ کے انگارے کی طرح اُن کے دل و دماغ پر رکھا رہتا ہے کہ ہماری بُرائی کا

حال کھل نہ جائے۔ ایسے مُجرم پکڑے بھی جاتے ہیں۔ بزرگوں نے کہا ہے سو دِن چور کے ایک دِن سَادھ کا۔ یعنی چور کبھی نہ کبھی پکڑا ضرور جاتا ہے اور اپنے کیے کی سَزا پاتا ہے اور چلو یوں نہ بھی ہو تو آخرت میں تو وہ ضرور گھاٹے میں رہے گا۔ قیامت کے دن جب سب کے اچھّے بُرے کاموں کا حساب ہوگا تو غلط کام کرنے والوں کو سَزا ملے گی۔ وہاں کوئی چال بازی کام نہ آئے گی"۔

"بالکل ٹھیک امّی جان، بالکل ٹھیک۔ گناہ کرنا تو سراسر گھَاٹے کا سَودا ہے۔ میں ایک بار پھر توبہ کرتا ہوں۔ اِن شَاءَ اللہ کبھی بھول کر بھی کوئی ایسی بات نہ سوچوں گا جِسے گناہ کہا جاتا ہے اور امّی جان، اللہ کی رحمت کا معاملہ تو یہ ہے کہ خود ہم اپنی حالت پر غور کر کے دیکھ سکتے ہیں۔ یہ اس کی رحمت ہی تو ہے کہ میری معمولی تنخواہ میں ہمارا گزارہ ہو جاتا ہے۔ رہی عزت، تو اس کا معاملہ تو یہ ہے کہ میں اپنے رب کا شکر ادا کرتا رہتا ہوں۔ جہاں بھی جاتا ہوں لوگ سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ میری بھی تعریفیں کرتے ہیں اور ابّا جی کی بھی۔ آپ دُعا کیجیے اللہ مجھے اِس راستے پر چلتے رہنے کی توفیق دے"۔

"اور یہ توفیق بھی دے کہ تو اپنے وطن پاکستان کی خدمت کرے۔ اس کی شان بڑھائے۔ اِدھر آ میں تیری پیشانی پر بوسہ دوں"۔

میاں آصف نے امّی کی طرف سَر جھکا دیا۔ اُنھوں نے اُس کی پیشانی پر ہونٹ رکھ دیئے اور اُسے یوں لگا کہ نور کی ایک لہر اُس کے پورے وجود میں اُتر گئی ہے۔

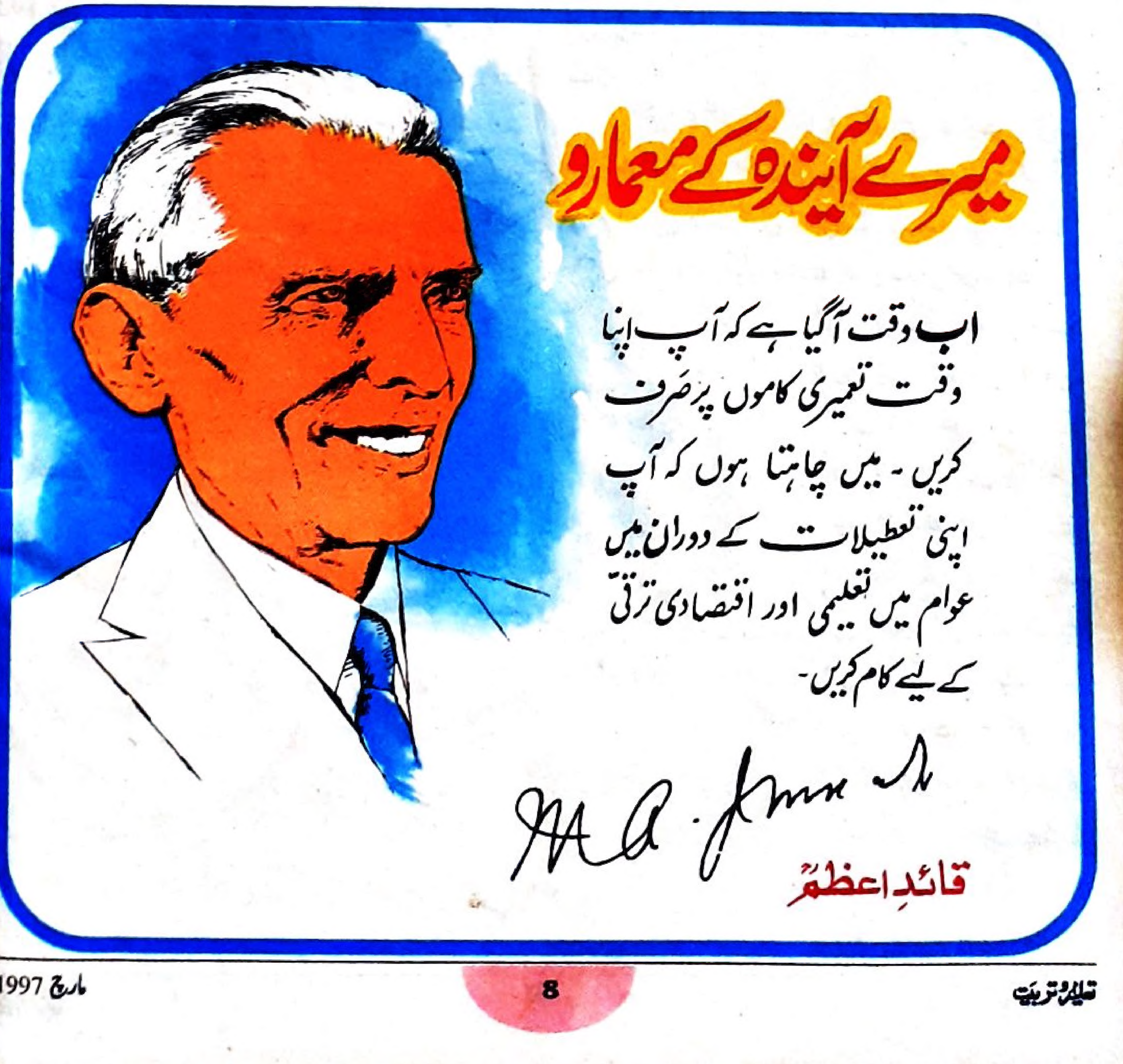

Sharjeel Ahmed

چوتھائی روٹی

اشتیاق احمد

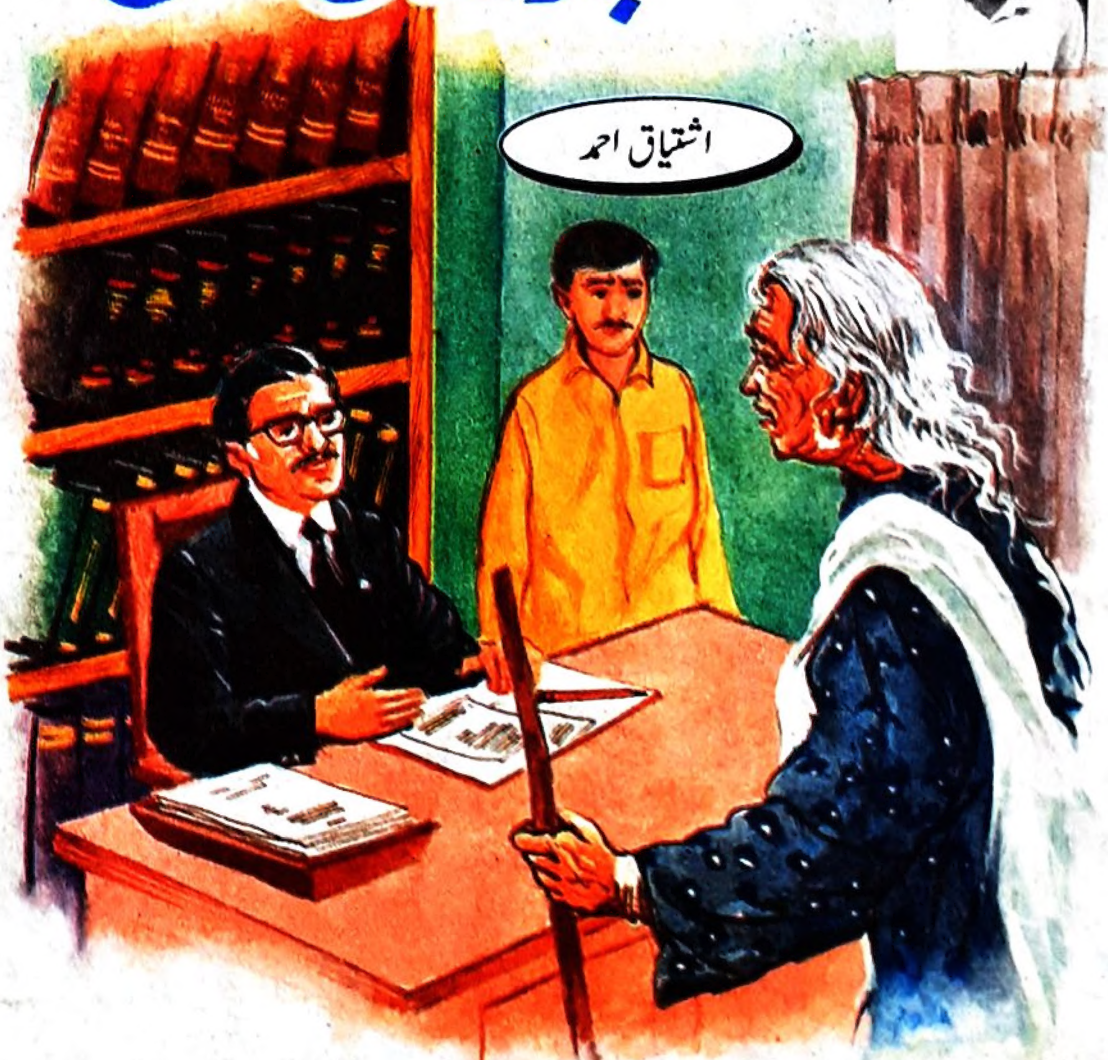

بوڑھی عورت بُری طرح رو رہی تھی- بس روئے جا رہی تھی اور کسی طرح چُپ ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی- "دیکھئے ماں جی.... جب تک آپ بات نہیں بتائیں گی- اُس وقت تک میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکوں گا' نہ کسی کام آ سکوں گا- آپ مہربانی فرما کر بات بتائیں' بات" یہ الفاظ میں نے تیسری بار کہے- وہ میری بات سُننے کے لیے ذرا دیر تک رُکی- میرے خاموش ہوتے ہی اُس نے پھر رونا شروع کر دیا- میں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا-

"باہر نکالوں اِسے- پاگل معلوم ہوتی ہے" میرے نائب نے کہا-

"ایک منٹ ٹھہریے" میں نے اس سے کہا- پھر بڑھیا کی طرف مُڑا-

"میں آپ کو کتنی بار کہوں- آپ جب تک بات نہیں بتائیں گی اس وقت تک میں آپ کے لیے کچھ نہیں کر سکوں گا- اور دیکھئے میرا وقت بہت قیمتی ہے اور پھر لوگ باہر میرا انتظار بھی کر رہے ہیں" میں نے ایک بار پھر نرم گرم الفاظ ادا کیے-

میرے بولنے تک وہ رُکی رہی پھر اس نے رونا شروع کر دیا-

"سر' آپ بِلاوجہ پریشان ہو رہے ہیں- نکال باہر کیجئے اِسے"-

"نہیں بھئی بُری بات ہے- اس کی عمر دیکھ رہے ہیں آپ" میں نے اپنے نائب کو ڈانٹ دیا- مگر اُس کا رونا اب بھی جاری و ساری تھا-

"اچھا ٹھیک ہے- آپ اس طرف بیٹھ کر روتی رہیے- میں ذرا دوسرے لوگوں سے فارغ ہو لوں- اگلے ملاقاتی کو بلائیے بھئی"-

"اوکے سَر" میرا چپراسی بولا اور ایک اور شخص کو اَندر لے آیا-

میں اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔ ایک ایک کر کے ملاقاتی آتے اور جاتے رہے، وہ بدستور روتی رہی۔

"یہ عورت پاگل معلوم ہوتی ہے جناب"۔ ایک مُلاقاتی نے کہا۔

"پاگل جب روتے ہیں تو اُن کی آنکھوں میں آنسو نہیں ہوتے" میں نے مُسکرا کر کہا۔

آخر میں تمام لوگوں سے فارغ ہو گیا۔ میرا گھر جانے کا وقت ہو گیا تھا۔ میں نے اُس کی طرف دیکھا۔

"اماں جی، میرا دفتر کا وقت ختم ہو چکا ہے۔ لیکن آپ کا رونے کا وقت ختم نہیں ہوا۔ مہربانی فرما کر اب یہ پروگرام کل پر اٹھا رکھیے۔ میں روزانہ پانچ بجے شام دفتر آ جاتا ہوں۔ آپ اَب کل پانچ بجے آ جائیں اور اپنا کام شروع کر دیجیے گا۔ میں کوئی اعتراض نہیں کروں گا"۔

اُس نے جیسے میرے الفاظ سنے ہی نہیں۔ بس روتی رہی۔ میں ایک بار پھر سَر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ میرے نائب نے میری یہ حالت دیکھی تو مسکرا دیا اور بولا "سَر، یہ کوئی پاگل عورت ہے۔ آپ جائیں۔ ہم اِسے دفتر سے نکال دیں گے"۔

یہ وہ الفاظ تھے جو اُسے ہوش میں لانے کا سبب بن گئے۔ اس کے رونے میں یک لخت بریک لگ گئی۔ تیزی سے میری طرف مُڑی۔ "نن... نہیں.... میں پاگل نہیں ہوں۔ مصیبت کی ماری ہوں۔ میرے بَتّا"۔

"خُدا کا شکر ہے آپ بولیں تو۔ اَرے مگر یہ آپ نے کیا کہا، میرے بَتّا۔ یہ بَتّا کیا ہوتا ہے؟" میں بوکھلا اُٹھا۔

"مذاق نہ کریں وکیل صاحب۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں بَتّا کیا ہوتا ہے۔ اچھا میں بتاتی ہوں۔ میرا ایک ہی بَتّا ہے۔ وہ جب پاکستان بنا تھا نا، جب مار کاٹ ہوئی تھی۔ لیکن آپ کو کہاں یاد ہوگا۔ آپ کی کتنی عُمر ہے بھلا"۔

"اب آپ میری عُمر پر اتر آئیں۔ خیر میں اس وقت پچپن سال کا ہوں۔ جب پاکستان بنا تھا پانچ سال کا تھا۔ تو پھر؟" میں نے جلدی جلدی کہا۔

"اس وقت سکھوں کے ہاتھوں میرا آدمی مارا گیا تھا۔ اُس وقت میرا ایک بَتّا تھا۔ تین سال کا۔ مطلب یہ کہ آپ سے دو سال چھوٹا۔ اَب وہ خوب بڑا ہو چکا ہے۔ آپ کے جتنا۔ اُسے پولیس نے پکڑ لیا ہے۔ بلاوجہ۔ بم دھماکے میں، ایک جگہ بم دھماکا ہوا۔ وہ اِتفاق سے وہاں موجود تھا۔ مارے ڈر کے بھاگا تو پولیس نے اُسے پکڑ لیا۔ اَب وہ کہتی ہے کہ یہ دھماکا اُسی نے کیا ہے۔ جب کہ ایسا نہیں ہے۔ میرا بَتّا تو مزدور ہے۔ رَاج مزدور۔ لیکن آپ رَاج کا مطلب کہاں سمجھیں گے۔ وہ جو عمارتیں بناتے ہیں، مستری لوگ۔ اُن کے ساتھ مزدوری کرتا ہے۔ ایسے مزدور بھی بھلا بم دھماکے کرتے ہیں؟ میں نے تو سُنا ہے بم دھماکے کرنے والوں کو لاکھوں روپے دیتے ہیں، دھماکے کرانے والے ظالم۔ وکیل صاحب، ہمارے گھر چل کر دیکھ لیں۔ اگر آپ کو پانچ سو روپے سے زیادہ وہاں مِل جائیں تو جو چور کی سزا وہ میری۔ اب آپ ہی بتائیں آج کے زمانے میں وکیل دس پندرہ ہزار سے کم فیس کی تو بات بھی نہیں کرتے۔ آخر میں کہاں جاؤں؟ وکیل کیسے کروں؟ کسی نے بتایا ہے کہ آپ بہت خُدا ترس ہیں۔ خدارا آپ میرے بیٹے کی وکالت کریں۔ میں آپ کو بس پانچ سو روپے دے سکتی ہوں"۔

"کیا کہہ رہی ہو مائی۔ ہمارے سَر ہر قسم کے مقدمے کی فیس پچیس ہزار لیتے ہیں"۔

"ارے باپ رے۔ یہ موئی۔ پچیس ہزار کہاں سے لائے گی۔ توبہ توبہ۔ بَتّا اب میں کہاں جاؤں۔ اس لیے رو رہی تھی میں"۔ یہ کہتے ہی اس نے پھر زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ ایسے میں اس کے سر سے دوپٹہ سرک گیا اور مجھے اُس کے کان کی لو نظر آ گئی۔ کٹی ہوئی کان کی لَو۔ میں بہت زور سے اُچھلا۔

"آپ نے کیا بتایا تھا۔ آپ کے خاوند کو سکھوں نے مار ڈالا تھا۔ 1947ء میں جب پاکستان بَنا تھا"۔

"ہاں.... ہندوؤں اور سکھوں نے پاکستان کی طرف سفر کرنے والے مسلمانوں پر تابڑ توڑ حملے کیے تھے۔ اُنہیں قتل کیا۔ اُن کا سامان لوٹا۔ اُن کے بچّوں کو نیزوں کی انیوں پر اُچھالا۔ اُن کے بیٹوں کو.....۔ اب میں کیا کیا بتاؤں۔ مسلمانوں پر کتنے ظلم کے پہاڑ توڑے گئے۔ اُن مظلوموں میں مَیں بھی شامل تھی۔ میرے بھی ایک کان کی لَو کاٹ دی تھی ظالموں نے۔ میں اپنے بچّے کو گود میں دبائے نہ جانے کِس طرح بچ نکلی اور پاکستان آنے والی ایک گاڑی میں سوار ہو گئی تھی۔

"اس گاڑی کا کوئی واقعہ یاد ہے آپ کو" میں نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔ اب میرے نائب نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

"ہاں اس گاڑی پر بھی ہندوؤں اور سکھوں نے مل کر حملہ کیا تھا۔ لیکن عین وقت پر پاکستانی فوجی وہاں پہنچ گئے تھے۔ اُن کی فائرنگ سے ہندو اور سکھ بھاگ نکلے تھے"۔

"اور کوئی واقعہ اُس گاڑی کا یاد ہے آپ کو؟"

"ایک اسٹیشن پر گاڑی رُکی تو خون میں نہائے بہت سے مسلمان مَرد، عورتیں اور بچّے سوار ہوئے تھے۔ گاڑی میں اگرچہ بالکل جگہ نہیں تھی پھر بھی مُسلمانوں نے اُنہیں کِسی نہ کِسی طرح جگہ دی تھی"۔

"اُس گاڑی کا کوئی اور واقعہ یاد ہے آپ کو؟" میں نے کھوئی کھوئی آواز میں پوچھا۔

"اب میرے نائب اور اُس عورت نے بوکھلا کر میری طرف دیکھا۔ پھر عورت نے نفی میں سَرہلاتے ہوئے کہا "اور کوئی واقعہ تو یاد نہیں۔ ہاں چھوٹی موٹی بے شمار باتیں یاد ہیں۔ ایسی تو اَن گنت باتیں سُنا سکتی ہوں۔ پہلے ہندو، مُسلمان اور سکھ کتنے پیار اور محبت سے رہتے تھے۔ پاکستان بنتے ہی ہندو، سکھ یک دَم بدل گئے۔ ساری محبت بھول گئے۔ ایک دم بھیڑیے بن گئے"۔

"میں گاڑی کی بات کر رہا ہوں"۔

"گاڑی کی کوئی اور بات؟" اس نے سوالیہ انداز میں کہا۔ "ہاں... خیر ایک بات میں بتاتا ہوں۔ خون میں نہائے لوگ جب اُس گاڑی پر سوار ہوئے تو اُن میں ایک مَرد اور عورت کے ساتھ ایک بچّہ بھی تھا۔ پانچ سال کا بچّہ۔ اس بچّے کے ساتھ ایک عورت اپنے بچّے کو گود میں لیے بیٹھی تھی۔ اُس کے کان کی لَو سے خون بہ رہا تھا۔ ایسے میں اُس عورت کے بچّے نے کہا "ماں... مُجھے بھوک لگی ہے۔ اس پر اُس عورت نے کہا۔ اچھّا بیٹا" یہ کہ کر اُس نے ایک رومال کھولا۔ اس رومال میں ایک روٹی تھی۔ وہ اُس نے اپنے بچّے کو دے دی۔ اُس وقت سامنے بیٹھا بچّہ اپنے ماں باپ سے بار بار کہنے لگا۔ مجھے بھی بھوک لگی ہے۔ مُجھے روٹی دو، روٹی دو۔ اِن زخمی ماں باپ کے پاس روٹی نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ اس وقت اس عورت نے---- کان کی لَو کٹی عورت نے، اُس روٹی میں سے چوتھائی روٹی اس بچّے کو دے دی۔ کیا آپ کو یہ واقعہ یاد نہیں" میں یہاں تک کہ کر خاموش ہو گیا۔

"نَن نہیں۔ اِتنی مدت گزر گئی۔ مُجھے تو یہ بات یاد نہیں"۔

"لیکن مُجھے اچھّی طرح یاد ہے۔ وہ بچّہ جِسے آپ نے چوتھائی روٹی دی تھی، میں ہی تھا۔ اُس گاڑی میں زخموں سے چور، ہمارا ہی قافلہ سوار ہوا تھا۔ آج میں اس چوتھائی روٹی کا بدلا آپ کو ضرور دوں گا۔ جائیے میں آپ کے بیٹے کا مقدمہ مُفت لڑوں گا۔ بالکل مفت۔ اور آپ فکر نہ کریں اگر آپ کا بیٹا بے گناہ ہے تو میں اسے اِن شاء اللہ رہا بھی کراؤں گا۔ بس آپ میرے لیے دعا کیجیے گا"۔

"سر یہ کیا؟ چوتھائی روٹی کی قیمت پچّیس ہزار روپے؟" میرے نائب کا مُنہ کھُلا کا کھُلا رہ گیا۔

"ہاں بھئی، وہ روٹی بُہت قیمتی تھی۔ بُہت زیادہ قیمتی"۔

☆☆☆☆☆

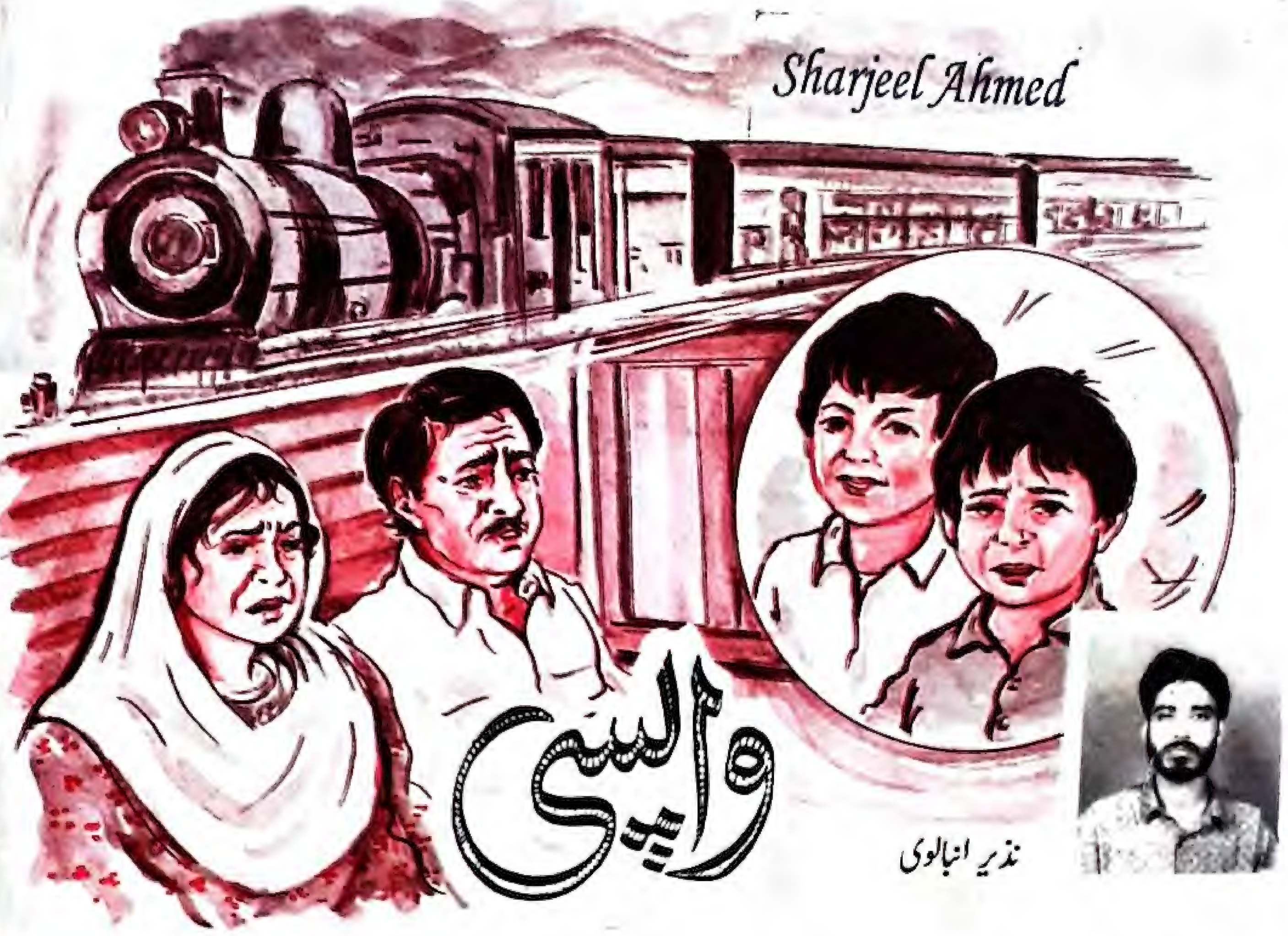

واپسی

نذیر انبالوی

گاڑی آہستہ آہستہ اپنی منزل کی طرف بڑھ رہی تھی۔ شیر محمد اور اس کی بیوی، کلثوم مسافروں سے بھرے ڈبّے میں ایک طرف بیٹھے تھے۔ شیر محمّد کو اُس کے بیٹے بلال کی یادوں نے گھیر رکھا تھا۔ اُسے بلال کی ایک ایک بات یاد تھی۔ وہ دن بھی یاد تھا جب پیارا سا سُرخ و سپید رنگ والا بلال پیدا ہوا تھا۔ نام رکھنے کا مرحلہ آیا تو دادی جان بولیں "میں تو اپنے پوتے کا نام بلال رکھوں گی"۔

"امّی جان، جو نام آپ کو پسند ہے ہمیں بھی وہی پسند ہے" شیر محمّد نے کہا۔

دادی جان بلال سے بُہت محبّت کرتی تھیں۔ جب بلال بولنے اور چلنے لگا تو سب گھر والے بُہت خوش ہوئے۔ وہ "دَد- دَد-- دَد-- دادی" کہتا تو اُس کی دادی اُسے خوب پیار کرتیں، اپنی گود میں بٹھا لیتیں۔ جب دادی اُس سے پوچھتیں کہ وہ کِس کا بیٹا ہے تو وہ فوراً کہ دیتا "اپنی دادی کا"۔

شام کو ابّا جان دفتر سے آتے ہوئے پھل لاتے تو دادی جان پھر اُس سے سوال کرتیں "بلال کِس کا بیٹا ہے؟"۔

"اپنے ابّو جان کا" پھل اپنا اثر دِکھا جاتے۔

"ٹھیک ہے، اپنے ابّو جان کے ہی رہو، میں اب آپ کو بابا کی دُکان سے ریوڑیاں لے کر نہیں دوں گی۔ جاؤ میں تُم سے نہیں بولتی" دادی جان جھوٹ موٹ روٹھ جاتیں۔ بلال منانے کے لئے آگے بڑھ کر اُن کی گود میں بیٹھ جاتا اور مُسکرا کر کہتا "دادی جان، میں تو آپ کا بیٹا ہوں-- صرف آپ کا۔ اَب آپ مجھے بابا کی دُکان سے ریوڑیاں لے کر دیں گی ناں"۔

"ہاں، ہاں، کیوں نہیں" دادی یہ کہتے ہوئے اُس سے پھر پیار کرنے لگتیں"۔

بلال کی دادی جان چند دن بیمار رہ کر انتقال کر گئیں تو وہ بُہت اُداس ہوا۔ دادی کے بغیر گھر سونا سونا

ہو گیا تھا۔ وہ اپنے اَبّو سے بار بار پوچھتا تھا "اَبّو جان' میری دادی کہاں گئی ہیں"۔

"بہت دور۔۔۔ اللہ میاں کے پاس"۔

"آپ دادی جان کو اللہ میاں کے ہاں سے واپس بُلا لیں۔ میں نے اُن کے ساتھ بابا کی دُکان سے ریوڑیاں لینے جانا ہے" بلال نے کہا۔

"بیٹے جو اللہ میاں کے پاس چلے جاتے ہیں وہ کبھی واپس نہیں آتے"۔

"کیوں واپس نہیں آتے؟" بلال نے پوچھا۔

"اللہ میاں اپنے پیاروں کو اپنے پاس ہی رکھتا ہے" شیر محمد نے کہا۔

"دادی جان اللہ میاں کی پیاری ہیں تو کیا میں اللہ میاں کا پیارا نہیں؟"

"میرے بیٹے' اتنی باتیں مت کیا کرو۔ کِسی کی نظر لگ جائے گی" شیر محمد کہتا تو بلال خاموش ہو جاتا۔

گاڑی ایک اسٹیشن پر رُکی تو شیر محمد کی یادوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ ڈبّے کے تمام دروازے اور کھڑکیاں بند تھیں۔ اگست کا مہینا تھا۔ گرمی کی وجہ سے دَم گھُٹ رہا تھا۔ کچھ ڈبّوں پر سِکھوں نے حملہ کر کے عورتوں اور بچّوں سمیت بہت سے لوگوں کو شہید کر دیا تھا۔ جب گاڑی چلی تو ایک مرتبہ پھر بلال کی یادوں نے شیر محمد کو آ لیا۔

بلال کو تِتلیاں بہت پسند تھیں۔ وہ جب بھی باغ میں سیر کرنے جاتا رَنگ بَرنگی تِتلیوں کو پکڑنے کی کوشش ضرور کرتا۔ رَنگ بَرنگی تِتلیاں اُس کی کم زوری تھیں۔ ایک دِن اُس نے پوچھا تھا "ابّا جان تِتلیوں کو اِتنے خوب صورت رنگ کِس نے دیئے ہیں؟"

"اللہ میاں نے" شیر محمّد نے جواب دیا۔

ایک شام شیر محمّد دفتر سے گھر آیا تو اُس نے دیکھا کہ بلال صحن میں اپنے دوستوں کے ساتھ کھیل رہا ہے۔

"بھئی کون سا کھیل کھیلا جا رہا ہے؟" شیر محمّد نے پوچھا۔

"پاکِستان۔۔۔ پاکِستان" بلال نے جواب دیا۔

"یہ کون سا کھیل ہے؟" شیر محمد نے پوچھا۔

یہ سن کر بلال نے اپنے دوستوں کو اشارہ کیا تو پورا گھر "لے کر رہیں گے پاکِستان - بَن کے رہے گا پاکِستان - پاکِستان کا مطلب کیا۔ لَا اِلٰہ اِلاَّ اللّٰہ" کے نعروں سے گونجنے لگا۔ یہ نعرے سُن کر شیر محمّد کو یقین ہو گیا تھا کہ اب پاکِستان بَن کر رہے گا۔

شیر محمّد اِنہی سوچوں میں گُم پاکِستان پُہنچا۔ گاڑی لاہور اسٹیشن پر رُکی تو سَب کی آنکھوں میں خون کے آنسو تھے۔ مہاجر اگرچہ زخموں سے چور تھے مگر اپنا پاک وَطن ملنے پر اُن کے دِل مطمئن تھے۔ شیر محمّد کا ایک دوست اَجمل پاکِستان بننے سے پہلے کا لاہور میں رہتا تھا۔ شیر محمّد اپنی بیوی کے ساتھ پاکِستان پُہنچا تو اُس کے دوست نے اپنے مکان کا ایک حِصّہ اُن کے لیے خالی کر دیا اور کہا "جب تک حکومت آپ کو کوئی مکان نہیں دے دیتی آپ میرے ہاں رہیں"۔

چُناں چہ شیر محمّد اور اُس کی بیوی کلثوم اُس دن سے اَجمل کے ہاں ہی ٹھہرے ہوئے تھے۔ اُنہیں پاکِستان میں آئے پندرہ دِن ہو گئے تھے کہ ایک دِن شیر محمّد سَودا سَلف لینے بازار گیا۔ اُس نے شاہ عالمی چوک میں ایک بچّہ دیکھا۔ جو رو رہا تھا۔ وہ بلال ہی کی عُمر کا تھا۔ شیر محمّد اُس کی طرف بڑھا اور اُس کے سَر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "قلفی کھاؤ گے؟" بچّے نے قُلفی کا سُن کر' روتے ہوئے ہاں میں سَر ہلا دیا۔ اور پِھر تھوڑی دیر بعد بچّہ قُلفی کھانے میں مصروف تھا۔

"تمھارے اَمّی اَبّو کہاں ہیں؟" شیر محمّد نے پُوچھا مگر بچّے نے کوئی جواب نہ دیا۔ شیر محمّد نے آس پاس کے لوگوں سے بچّے کے بارے میں معلوم کیا۔ مگر اُسے اس کے والدین کے بارے میں کچھ پتا نہ چل سکا۔ پھر اُس نے بچّے کو گود میں اُٹھا لیا۔

"ریوڑیاں کھاؤ گے؟" شیر محمّد نے پوچھا۔

بچّے نے بولنے کے بجائے پھر ہاں میں سَر ہلا دیا۔

شیر محمّد نے جب بچّے کو ریوڑیاں دیں تو وہ ننّھے منّے دانتوں سے اُنہیں چبانے لگا۔ ریوڑیاں ختم ہوئیں تو بچّہ پھر رونے لگا۔

"تتلی لو گے؟ خوب صورت تتلی" شیر محمّد نے پوچھا۔

"ہاں، لوں گا تتلی" بچّہ پہلی بار بولا۔

"میں تمہیں پیاری سی تتلی لا کر دوں گا۔ رنگ برنگے پروں والی" شیر محمّد نے کہا۔

شیر محمّد یہ سوچ کر بچّے کو گھر لے آیا کہ جب اُس کے والدین ملیں گے تو اُسے اُن کے حوالے کر دے گا۔ گھر آتے ہی بچّہ پھر رونے لگا۔ رونے کی آواز سُن کر اُس کی بیوی پریشان ہو گئی۔ فوراً اپنے کمرے سے باہر آئی۔ صحن میں شیر محمّد ایک بچّے کو گود میں لیے کھڑا تھا۔

"یہ کس کا بچّہ ہے؟" کلثوم نے پوچھا تو شیر محمد نے بچّے کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔

"آ جا میرے راج دلارے---- آ جا---- چُپ ہو جا---- نہ جانے تو کس ماں کے جگر کا ٹکڑا ہے" کلثوم نے کہا اور اسے گود میں بیٹھا لیا۔

بچّہ کلثوم کی گود میں آ کر یک دم چُپ ہو گیا۔ کلثوم نے اُسے جی بھر کر پیار کیا۔ اُس کے بال سہلائے۔ اُس کا مُنہ چوما۔ کلثوم کو یوں لگا جیسے اُس کا بلال اُسے مل گیا ہو، جسے سکّھوں نے اُس کی آنکھوں کے سامنے شہید کر دیا تھا۔ بچّہ کلثوم کی گود میں سو گیا۔ شام کو جب سو کر اُٹھا تو کلثوم نے اُس کے لیے دودھ گرم کیا۔ دودھ پی کر بچّہ پھر رونے لگا۔

"کیوں رو رہے ہو میرے لال" شیر محمد نے کہا۔

"میں ماتا جی کے پاس جاؤں گا---- مجھے ماتا جی کے پاس چھوڑ آؤ"۔

"ماتا جی کے پاس؟---- ارے یہ تو ہندو ہے۔ میں کسے اپنے ساتھ لے آیا ہوں" شیر محمّد چلّایا۔ بچّہ سہم گیا۔ وہ خوف زدہ نظروں سے دونوں کو تکنے لگا۔ "کیا نام ہے تمہارا؟" شیر محمّد کا لہجہ اب کی بار تلخ تھا۔

"دیپک" بچّے نے کہا۔

"تمہارے ماں باپ کہاں ہیں؟" کلثوم نے پوچھا۔

"ہمارے گھر کو کسی نے آگ لگا دی تھی۔ پتا جی کو تو میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے آگ میں جلتے ہوئے دیکھا تھا البتہ ماتا جی کا پتا نہیں کہ وہ کہاں ہیں"۔

شیر محمّد نے نفرت سے بچّے کو گھورا "چلو میں تمہیں جہاں سے لایا ہوں وہیں چھوڑ آؤں"۔

"میں اسے جانے نہیں

دوں گی---- یہ میرے پاس رہے گا" کلثوم نے کہا۔

"ہندو بچّہ ہمارے گھر نہیں رہے گا" شیر محمد نے کہا۔

"ہر بچّہ دینِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے۔ یہ تو اُس کے والدین ہیں جو اُسے یہودی یا نصرانی بنا دیتے ہیں-- میں دیپک کو بلال کی طرح اپنا بیٹا بنا کر رکھوں گی" کلثوم نے کہا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" شیر مُحمّد بولا۔

میاں بیوی کی بحث سُن کر اجمل صاحب نے کہا "شیر مُحمّد' بھابی ٹھیک کہ رہی ہیں۔ کوئی بچّہ ہندو یا سِکھ نہیں ہوتا وہ بس بچّہ ہوتا ہے۔ اس بچّے کو اُس وقت تک یہاں رہنا چاہئے جب تک اِس کی ماں کا پتا نہیں چل جاتا"۔

شیر مُحمّد خاموش رہا۔ دیپک نے چند دن تو ماتا جی کو یاد کیا مگر پھر وہ کلثوم کی محبت کے سامنے اپنی ماتا کو بھول گیا۔ دیپک کی عادتیں بِالکل بلال جیسی تھیں۔ وہ ہر بات پر بلال کی طرح سوال کرتا تھا۔ کلثوم تین ماہ کے عرصے میں اس سے اس طرح محبّت کرنے لگی جیسے یہ اُس کا اپنا بیٹا ہو۔ مگر شیر مُحمّد نے اُس کی ماں کی تلاش جاری رکھی۔ آخر ایک دن وہ اِس کوشش میں کام یاب ہو گیا۔ اُس نے کلثوم سے کہا "دیپک کی ماں کا پتا چل گیا ہے۔ ایک ہسپتال میں داخل ہے۔ وہ اپنے خاوند کو بچاتے ہوئے بُری طرح جُھلس گئی تھی۔ آؤ ہم دیپک کو اس کی ماں کے پاس چھوڑ آئیں"۔

شیر مُحمّد کی یہ بات سُن کر کلثوم کو ایک جھٹکا سا لگا

"کیا سچ مچ ہم دیپک کو اس کی ماں کے حوالے کر دیں گے؟" کلثوم کو ابھی تک شیر مُحمّد کی کہی ہوئی بات پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

"ہاں ہمیں ایسا ہی کرنا چاہیے۔ دیپک اب تک ہمارے پاس امانت تھا" شیر محمد نے کہا۔

کلثوم دیپک کی جدائی کے آنے والے لمحوں کے

متعلق سوچ کر لرز گئی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

شام کے وقت وہ ٹیکسی میں ہسپتال جا رہے تھے۔ کلثوم نے دیپک کو اپنے سینے سے لگا رکھا تھا۔ وہ بار بار اسے چوم رہی تھی۔ شیر مُحمّد خاموش تھا۔ ہسپتال پہنچ کر وہ ایمرجنسی وارڈ میں داخل ہوئے۔ دیپک کچھ نہیں سمجھ پا رہا تھا کہ وہ یہاں کیوں آئے ہیں۔ اُس نے پوچھا بھی مگر وہ دونوں خاموش رہے۔ بیڈ نمبر 14 کے قریب پہنچے تو وہ خالی تھا۔

"اِس بیڈ کی مریضہ کہاں ہے؟" شیر مُحمّد نے پوچھا۔

"وہ تو جی اللہ کو پیاری ہو گئی ہے---- بہت تکلیف میں تھی بے چاری" وارڈ بوائے نے بتایا۔

شیر مُحمّد نے کلثوم کی طرف دیکھا۔ وہ سب کچھ سمجھ گئی تھی۔ اس نے دیپک کو گود میں اٹھا لیا۔ اور اُس سے پیار کرنے لگی۔

"بچّے تو معصوم ہوتے ہیں اور فِطرت الٰہی کے مطابق پیدا ہوتے ہیں۔یہ تو اُن کے والدین ہیں جو انہیں ہندو یا سِکھ بنا دیتے ہیں۔ دیپک اب ہمارے پاس رہے گا۔ ہم اِسے بلال کی طرح چاہیں گے" یہ کہتے ہوئے شیر مُحمّد نے بھی اُس کے سر پر محبّت سے ہاتھ رکھ دیا۔ (مرکزی خیال ماخوذ)۔

ڈاکٹر رضوان ثاقب

ایک دیوانہ

Sharjeel Ahmed

بعض دیہاتی لوگوں کا خیال ہے کہ 'جو لوگ پاگل' دیوانے یا مجذوب ہوتے ہیں وہ جو کہتے ہیں وہ ہو جاتا ہے۔ اُن کی دعائیں جلد قبول ہوتی ہیں اور اللہ تعالیٰ دنیا پر رحمت اور خوش حالی اُن ہی کے صدقے بھیجتے ہیں۔ ان لوگوں کا یہ خیال کہاں تک درست ہے' اِس بارے میں ہم کوئی تبصرہ نہیں کرنا چاہتے۔ لیکن آج سے 99 سال پہلے 14 نومبر 1897ء کو ایسا ہی ایک واقعہ پیش آیا جسے یہاں بیان کیا جا رہا ہے۔

یہ پنجاب کے ضلع حصارپور کی تحصیل گڑھ شنکر کے ذیلی گاؤں موہڑ کا واقع ہے۔ اِس گاؤں میں شاہ محمّد نامی ایک کسان رہتا تھا۔ جو بڑا نیک دل اور محنتی تھا۔ لوگ اُس کی صلہ رحمی اور ایمان داری کی بہت تعریف کرتے تھے۔ یہ انیسویں صدی کے آخری سالوں (1897ء) کی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شاہ محمّد کو ایک چاند سا بیٹا عطا کیا۔ جس سال یہ بچّہ پیدا ہوا اس سال فصلیں خوب اُگیں۔ ہر طرف لہلہاتے کھیت نظر آنے لگے۔ لوگوں کو جب ڈھیروں مَن اناج حاصل ہوا تو وہ بہت خوش ہوئے اور خیال کرنے لگے کہ اُن پر یہ ساری رحمت اس بچّے کی وجہ سے کی گئی ہے۔ للٰذا لوگوں کے کہنے پر شاہ محمّد نے اپنے بیٹے کا نام رحمت رکھ دیا۔

رحمت کا باپ اگرچہ غریب کسان تھا مگر اُس کی خواہش تھی کہ جس طرح لوگوں کو اِس بچّے کی پیدائش کے وقت خوش حالی نصیب ہوئی ہے اِسی طرح بڑا ہو کر یہ لوگوں کے کام آئے۔

باپ نے اسے ابتدائی عُمر میں ہی مسجد بھیجنا شروع کر دیا۔ اس طرح وہ بچپن میں قرآن پڑھ گیا۔ پھر اسکول کا رُخ کیا۔ اُن دِنوں اسکول اتنے قریب نہ ہوتے تھے۔ کاریں اور موٹریں بھی نہ ہوتی تھیں۔ اِس لیے رحمت کو کئی کلومیٹر پیدل سفر طے کر کے اسکول جانا پڑتا تھا۔ رحمت جس اسکول میں پڑھنے کے لئے جاتا تھا وہ مِڈل اسکول تھا اور "راہون" گاؤں میں واقع تھا۔ رحمت عِلم کی دولت سے مالا مال ہونے کے لیے روزانہ راہون پہنچتا۔ اس طرح اس نے مِڈل کلاس کا امتحان اچھے نمبروں سے پاس کر لیا۔ پھر رحمت کو اینگلو سنسکرت ہائی اسکول جالندھر میں داخل کرا دیا گیا۔ رحمت نے یہاں بھی شان دار کارکردگی کا مظاہرہ کیا اور میٹرک کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس

کر لیا۔

بچّے کی علم کے ساتھ محبّت، لگن اور محنت کو دیکھ کر اس کا باپ اکثر یہ سوچتا کہ اس کا بیٹا بڑا ہو کر صرف گاؤں کے لیے ہی نہیں بلکہ پوری قوم کے لیے رحمت ثابت ہو گا۔ اس لیے اس نے اس کی تعلیم و تربیّت کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دیا۔

شاہ محمّد خوب محنّت سے کھیتی باڑی کرتا تاکہ زیادہ سے زیادہ کمائی ہو سکے اور رحمت کے تعلیمی اخراجات پورے ہوتے رہیں۔ اُسے تو ہر وقت یہی لگن رہتی کہ اُس کا بیٹا جلد از جلد پڑھ لکھ جائے۔ بیٹے نے بھی اپنے باپ کی محنت کو رائیگاں نہ جانے دیا۔ اُس نے خوب ڈٹ کر محنت کی اور ہر امتحان میں اعلیٰ کارکردگی دکھائی۔

لاہور میں ایک کالج ہے اِسلامیہ کالج سِول لائن' اس کو بڑی تاریخی اہمیّت حاصل ہے۔ طلبہ میں اِسلام کی فکر کو بیدار کرنے کے لیے جتنی بھی تنظیمیں اور تحریکیں اُٹھیں اِن میں سے اکثر اِسی کالج کے طلبہ نے اُٹھائیں۔

رحمت نے میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد اسی کالج کا انتخاب کیا۔ ذہین اور غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک طلبہ کی یہ نشانی ہوتی ہے کہ وہ صرف کتابی کیڑے نہیں بنتے بلکہ پڑھنے کے وقت پڑھتے ہیں اور باقی کے اوقات میں دوسری مثبت سرگرمیوں میں حصہ لیتے ہیں۔ رحمت بھی غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک تھا۔ وہ تعلیمی میدان میں بھی کسی سے پیچھے نہ تھا اور کالج کی ادبی سرگرمیوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تھا۔ وہ اپنے دور میں کالج کے ادبی مجلّے "دی کریسنٹ" کا اڈیٹر رہا۔ وہ کالج کے مقرروں کی انجمن "ڈی بیٹنگ یونین" کا سیکریٹری بھی تھا اور اس کا شمار کالج کے بہترین مقرروں میں ہوتا تھا۔ وہ دی کریسنٹ کے علاوہ دوسرے ملکی اخبارات و رسائل میں بھی مختلف موضوعات پر قلم اُٹھاتا۔ اُس دور میں مشہور اخبار' کشمیری گزٹ میں تو اُس نے باقاعدگی سے مضمون لکھنا شروع کر دیئے تھے۔ اس کے تمام مضمون مدلّل اور بامقصد ہوتے تھے اور لوگ اُنہیں بڑی دِل چسپی سے پڑھتے تھے۔ یہ اخبار مشہور صحافی' محمّد دِین فوق نکالتے تھے۔ ایک دفعہ رحمت کا ایک مضمون اس اخبار میں چھپا' عنوان تھا "مغرب کی اندھی تقلید"۔ اس مضمون میں رحمت نے اہلِ مغرب کے اصل چہرے کو بے نقاب کیا تھا۔

دیوانے' مجذوب اور پاگل کو واقعی اپنے نفع اور نقصان سے کچھ غرض نہیں ہوتی۔ وہ جو دیکھتا ہے وہی کہتا ہے۔ رحمت بھی ایسا ہی ایک دیوانہ تھا جس کا نہ کوئی ذاتی مفاد تھا اور نہ اُسے کسی قسم کے نقصان کا ڈر تھا۔ اس کے جی میں جو بات سما جاتی بس اُسے کہہ ڈالتا تھا۔ انگریز جو اُس وقت صاحبِ اقتدار اور صاحبِ اختیار تھے' اُن کو اُن کا اصل چہرہ دکھا دینا اور اُن کے گھناؤنے کردار کو سرِعام پھیلا دینا صرف اُس دیوانے کا ہی کام تھا۔ اس کے اس مضمون نے انگریز حکومت کے ایوانوں کو لرزا کر رکھ دیا۔ یہ قلم کی طاقت ہی تو تھی جس نے تلوار سے گہرا زخم لگایا تھا۔ اخبار کے اڈیٹر کو حکومت کی طرف سے دھمکیاں ملنا شروع ہو گئیں۔ کاروبار میں تو نفع اور نقصان پاؤں کی زنجیر بن جایا کرتی ہے۔ لہٰذا رحمت کے اس مضمون کے بعد اخبار کے مالک نے اس کے مضامین شائع کرنا بند کر دیئے۔

بہتا ہوا پانی بھلا کب رُکتا ہے۔ اُسے راستے کی رکاوٹوں سے غرض نہیں ہوتی۔ وہ اپنا راستہ تلاش کرنا جانتا ہے۔ پھر وہ تو تھا ہی دیوانہ' دیوانے بھلا کسی کے کہنے پہ کب رُکتے ہیں؟ اخباروں کا دروازہ بند ہوا تو لوگوں کو اپنے رنگ میں رنگنے کے لیے خود اُٹھ کھڑا ہوا۔ یہ اُس دور کی بات ہے جب رحمت لاء کالج کا طالبِ علم تھا۔ رحمت کے ہم جماعت انگریزی تہذیب میں رنگے ہوئے تھے اور انگریز کا کالا قانون رٹ رہے تھے۔ وہ بھلا رحمت کی باتوں کو کیسے ٹھنڈے پیٹوں برداشت کر سکتے تھے؟ لہٰذا روزانہ اُس کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے والے اُس کے اپنے ہی ہم جماعت اُس کے مخالف ہو گئے۔

"یار' یہ رحمت نے کیا فضا خراب کر رکھی ہے؟ جگہ جگہ ملّاں اِزم پھیلا رہا ہے۔ زیادہ اِسلام اِسلام کرنا ہوتا ہے تو کسی مسجد میں چلا جایا کرے' کالجوں میں بھلا ایسی باتیں کرنا کہاں کی شرافت ہے؟" اس کے ہم جماعت اس طرح کی کھُسر پھُسر کرنے لگے۔ بات یہاں تک ہی نہ رہی بلکہ رحمت کو ہر جگہ نیچا دکھانے کی کوششیں ہونے لگیں۔ وہ اساتذہ کو بھی اس کے خلاف بھڑکاتے رہے۔ لیکن اُس دیوانے نے کسی بات کی پروا نہ کی۔

ایک دن کا واقعہ ہے کہ بہت سارے لڑکے اکٹھے ہو کر رحمت کی شکایت کرنے پرنسپل کے دفتر پُہنچے اور رحمت کی سرگرمیوں کے بارے میں پرنسپل کو بتایا۔ پرنسپل سُن کر ہنس دیا اور کہنے لگا "یہ خوابوں میں رہنے والا دیوانہ ہے' یہ جس حکومت کے زیرِ سایہ رہ رہا ہے اُسی کے خلاف باتیں کرتا ہے۔ اس کے رسم و رواج کو غیر انسانی اور غیر فطری کہتا ہے اور پھر سب سے حیرت انگیز بات یہ کہ غلام ہو کر حکم ران بننے کے خواب دیکھتا ہے۔ بھلا اِس سے بڑھ کر اور دیوانگی کیا ہو سکتی ہے۔ لہٰذا اس کے خلاف کوئی تادیبی کارروائی کرنے کے بجائے اِسے اس کے حال پر چھوڑ دو"۔

آج رحمت کو کالج کے پرنسپل نے بھی دیوانہ کہہ دیا تھا مگر رحمت کو اس لقب کے ملنے کا بڑا فخر اور خوشی ہوئی۔ "حق بات کہنے والوں کو لوگوں نے ہر دور میں پاگل اور دیوانہ کہا ہے۔ پرنسپل صاحب دانش ور ہیں تو کیا ہوا' کیا اہلِ عرب سے بڑھ کر بھی کوئی عالم فاضل ہو سکتا ہے؟ اُن کے عُلما نے بھی تو دُنیا کے سب سے سچّے انسان کو مجنوں' دیوانہ اور جادوگر کہا تھا اور آج اگر ان القاب سے مجھے نوازا جا رہا ہے تو بھلا اس سے بڑھ کر قابلِ فخر بات اور کیا ہو سکتی ہے"۔ اس نے یہ سوچا اور اپنی جدوجہد کو مزید تیز کر دیا۔

رحمت جب اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے برطانیہ گیا تو بعض متعصب عُلما نے انگریزی تعلیم حاصل کرنے پر اُسے ایک بار پھر دیوانے کے نام سے پُکارا۔ مگر رحمت کا مؤقف یہ تھا کہ علم مومن کی میراث ہے اور کھویا ہوا مال ہے۔ یہ جہاں سے بھی ملے اسے لے لینا چاہیئے۔ پھر رحمت نے حصولِ علم کو فرض جانتے ہوئے' پنجابی اُردو' عربی' فارسی' انگریزی' جرمنی' فرانسیسی' اور اطالوی زبانوں پر عبور حاصل کیا اور تاریخ اور سیاست کے مضامین کا بھی ماہر بنا۔ بیرونِ مُلک علم کی پیاس بجھاتے ہوئے اُسے وطن کی یاد ہر وقت تڑپاتی رہتی مگر علم حاصل کرنے کا جذبہ اُسے واپس نہیں آنے دے رہا تھا۔

رحمت نے اپنی دھرتی اور اپنے لوگوں سے محبّت اور پیار کے اظہار کی ایک نئی راہ نکال لی۔ برطانیہ میں بسنے والے مسلمانوں سے رابطہ کر کے پاکستان نیشنل موومنٹ کی بنیاد ڈالی۔ 1932ء میں لندن ہی میں رہتے ہوئے ایک پمفلٹ لکھا۔ اِس پمفلٹ میں اُس نے ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن کا مطالبہ کیا۔

آج اس دیوانے نے پھر دیوانگی کے رنگ میں ایسی بات کہہ دی تھی کہ جس کو سنتے ہی مخالفوں کے پیٹ میں مروڑ اُٹھنے لگے تھے۔ اُس نے ریاضی کے سوالوں کی طرح پاکستان کی سرحدوں کا ایسا تعین کیا تھا کہ اسے جھٹلانا ناممکن ہو گیا تھا۔ اس نے لکھا "مسلمان اپنے لیے جس الگ ملک کا مطالبہ کر رہے ہیں اس کا نام "پاکستان" ہوگا۔ یعنی پاک لوگوں (مسلمانوں) کے رہنے کی جگہ۔ جب کہ اس لفظ "پاکستان" سے مراد ہوگا:

پ = پنجاب

ا = افغانیہ (شمال مغربی سرحدی صوبہ یعنی سرحد)

ک = کشمیر

س = سندھ

تان = بلوچستان

یعنی یہ پانچ علاقے جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہے' کو ملانے سے لفظ پاکستان بنتا ہے۔ لہٰذا یہ علاقے

مُسلمانوں کے حوالے کر کے اس کا نام پاکستان رکھ دیا جائے۔ اس دیوانے کی ذہانت اور عقل مندی کو دیکھ کر دنیا دنگ رہ گئی۔ تاریخ نے ایک بار پھر ثابت کر دیا کہ دنیا جن لوگوں کو مجنوں، دیوانہ اور پاگل کہتی ہے وہی لوگ سچّے، پُر خلوص اور دیانت دار ہوا کرتے ہیں اور ایسے ہی دیوانے اپنی قوم کے لیے رحمت اور خوش حالی کا باعث بنتے ہیں۔

لفظ "پاکستان" وہ جن دلائل اور حقیقتوں کے ساتھ وجود میں لایا تھا اپنے تو اپنے، غیر بھی اس لفظ کو جھٹلا نہ سکے۔ یہاں تک کہ غیر مسلم اخبارات نے بھی اس نئے ملک، جس کا مطالبہ مُسلمان کر رہے تھے، کو پاکستان لکھنا شروع کر دیا۔

اپنے گھر میں کوئی اہم واقعہ رونما ہو رہا ہو تو گھر کے سب افراد اکٹھے ہو جایا کرتے ہیں، وہ کہیں بھی ہوں اپنے گھر کا رُخ کرتے ہیں۔ لفظ پاکستان کے خالق، رحمت کو بھی 23 مارچ 1940ء کو لاہور میں ہونے والے ایسے ہی ایک اہم واقعہ کی خبر ملی تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر انگلستان سے یہاں پہنچ گیا۔ لیکن حکومتِ پنجاب نے اس کی گرفتاری کے وارنٹ جاری کر دیئے۔ لہٰذا اُسے مجبوراً واپس انگلستان جانا پڑا۔ آپ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ حکومت نے اُسے اپنے بھائیوں کے ساتھ مل بیٹھنے کی اجازت آخر کیوں نہ دی۔ اِس لیے کہ رحمت نے جس لفظ کو تخلیق کیا تھا اِس لفظ پر مُسلم مُلک کی بنیادیں کھڑی ہو رہی تھیں۔ ہندوؤں اور انگریزوں کو پتا چل گیا تھا کہ جسے لوگ دیوانہ کہتے تھے وہی ان سب سے سیانا ہے۔ لوگوں کو ایسی منزل کا پتا دے گیا جس کے سفر میں اُنھوں نے اپنا تن من دھن قربان کر دیا، پھر آج بھلا اس خِضرِ راہ کو حکومت اس کام یابی کا نظارہ کرنے کی اجازت کیوں کر دے سکتی تھی؟

ایک بار پھر جب 14 اگست 1947ء کو رحمت نے اپنی شب و روز کی محنت کے پھل، اپنے پیارے دیس، پاکستان کا رُخ کیا اور انگلستان سے لاہور پُہنچا تو مہاجرین کے لُٹے پٹے قافلے، کھلے آسمان تلے ٹھٹھرتے بچّے، بھوکے، پیاسے، بیمار اور زخمی بوڑھے اور نوجوان دیکھ کر رحمت کو بہت دُکھ ہوا۔ اِس صدمے سے اُسے دل کا دورہ پڑ گیا۔ ڈاکٹروں نے اُسے مکمل آرام کرنے کا مشورہ دیا۔ مگر اس نے جو لفظ تخلیق کیا تھا اس کا تیسرا حرف "ک" (کشمیر) ابھی دشمنوں کے قبضے میں تھا۔ جب اپنی منزل اور اپنا مقصد ادھورا نظر آئے تو ایسے دیوانے آرام کب کرتے ہیں۔ رحمت نے ڈاکٹروں کی تمام نصیحتوں کو پسِ پُشت ڈالتے ہوئے یورپ کا دورہ کیا، اپنے لفظ پاکستان کے حرف "ک" کے حصول کے لیے اقوام متحدہ کا دروازہ کھٹ کھٹایا اور اس بات پر زور دیا کہ کشمیر میں بسنے والے عوام سے ان کی رائے معلوم کی جائے۔ اپنے لفظ "پاکستان" کے ایک حرف کی تلاش میں اُسے کئی مہینے گزر گئے۔ موسم کے تھپیڑے اور سردی کی صعوبتیں پاؤں کا چھالا بن گئیں۔ یہ فروری کا مہینا تھا جب رحمت کو نمونیے نے گھیر لیا۔ کیمرج ہسپتال میں داخل ہوا مگر صحت نے وفا نہ کی۔ صحت سنبھلنے کے بجائے اور بگڑ گئی اور اسی مرض نے لفظ پاکستان کا خالق، مسلمان قوم کے عظیم مُحسن چودھری رحمت علی کو نظروں سے اوجھل کر دیا مگر وہ ہمیشہ کے لئے امر ہو گیا۔

اسلام کے اس دیوانے کو لندن کے عمانویل کالج کی سیڑھیوں کے پاس امانت کے طور پر دفن کر دیا گیا۔ تاکہ جب حالات معمول پر آئیں تو اُنھیں اُن کے اپنے وطن پاکستان میں کسی مُناسب جگہ پر شایانِ شان طریقے سے دفن کیا جا سکے۔ لیکن آج تک کسی حکم ران کو اِس کی توفیق نہ ہو سکی کہ اپنی اِس عظیم امانت کو اپنے وطن لا سکے۔ جس عظیم دیوانے نے غیروں میں رہ کر اپنا مُلک حاصل کرنے کی جدوجہد کی، جب ملک بنا تو اس ملک کے باشندے اِس کے جسدِ خاکی کے لئے دو گز جگہ بھی نہ دے سکے۔

ڈاکٹر عبدالرؤف

پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیاری باتیں

تحریکِ پاکستان میں مسلمان بچوں کا کردار

تحریکِ پاکستان میں مُسلمان بچّوں نے کیا کردار ادا کیا؟ آیئے اِس اہم موضوع کو بچّوں کی تعلیم و تربیّت کے اِسلامی نظریے کے عالمی پس منظر میں سمجھنے کی کوشش کریں۔ موضوع کا مرکزی نکتہ سمجھنے کی خاطر ہم نے اس حدیث نبویؐ کا انتخاب کیا ہے:

خَیْرُ الْاَشْغَالِ تَرْبِیَتُ الْاَطْفَال

بہترین مشغلہ بچّوں کی تعلیم و تربیّت ہے۔

قرآن کریم کی متعدد آیتوں اور حضرت مُحمّد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وسلم کی لاتعداد حدیثوں نے بچّوں کی تعلیم و تربیت کے ایک جامع، انقلابی اور عالم گیر فلسفہ کو جنم دیا۔ اس کے نتیجہ میں دنیا کے مختلف علاقوں میں مُسلمان بچّوں اور بڑوں کی ایک ایسی مُہذّب، روشن دماغ اور انقلابی پود سامنے آئی جس کی انسانی تاریخ میں نظیر نہیں ملتی۔ علم و اخلاق کے انہی عظیم نمونوں نے ایک ایسے تخلیقی فکر و عمل کا سنگِ بنیاد رکھا جس سے دنیا جہاں کی متعدد تعمیری تحریکیں اُبھریں۔ مثلاً احیاءِ علوم، صنعتی اِنقلاب، جدید سائنسی دور وغیرہ۔

بچّوں کی تعلیم و تربیّت کی اِسلامی تحریک سے برِصغیر پاک و ہند میں بھی بڑے مثبت اثرات برآمد ہوئے۔ یہاں ایک اِنقلابی بچپن وجود میں آیا جو بچّوں کی عام ڈگر اور عام ریت سے بالکل مختلف تھا۔ بچّوں کی اس نئی دنیا نے پھر تحریکِ پاکستان میں بھی بھرپور کردار ادا کیا۔ بچّوں کی بے شمار انجمنیں قائم ہوئیں۔ جنہوں نے حصولِ پاکستان کے لیے سیاسی جلسے جلوسوں میں اپنی اپنی بساط کے مطابق بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ گلی محلّے اور گاؤں بچّوں کے اِن جوشیلے نعروں سے گونجنے لگے: "لے کے رہیں گے پاکستان، بَن کے رہے گا پاکستان"۔ "پاکستان کا مطلب کیا ہے: لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ"

مسجدوں میں پاکستان کے قیام کے لئے دعائیں مانگی جاتیں تو بچّوں کی "آمین" کی آوازیں نمایاں سنی جاتی تھیں۔ بچّے اپنے جیب خرچ سے مسلم لیگ کے لیے چندہ بھی دیتے تھے اور مختلف سیاسی اور سماجی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصّہ بھی لیتے تھے۔ ایک دل چسپ بات یہ ہے کہ پاکستان قائم ہو جانے کے بعد بھی بہت سے بچّے پاکستان کے کئی علاقوں میں مدتوں تحریکِ پاکستان کے دَور کی نعرہ بازی میں مصروف نظر آتے تھے۔

یہ امر قابلِ غور ہے کہ مسلمان بچّوں کے منفرد نظام تعلیم و تربیت اور تحریک پاکستان نے بچّوں میں ایک ولولہ اور تڑپ پیدا کر دی تھی۔ یہ جوش و جذبہ اُن کے ہم عصر غیر مسلم بچّوں میں یکسر غائب تھا۔ اِنسانی حقوق کی تمام تحریکوں میں برِصغیر پاک و ہند کے مُسلمان بچّوں کا حِصّہ ہر اعتبار سے مثالی تھا۔

یہ بات بے حد افسوس ناک ہے کہ پاکستان بنتے ہی بچّوں سے اپنے مخصوص تعلیم و تربیّت کا رنگ اور اِسلامی تحریک کے اثرات بڑی تیزی سے زائل ہونے لگے۔ بچّوں کو اپنے ماحول سے لاتعلق کرنے اور ان کی تخریب کاری میں جس نے نمایاں حصّہ لیا وہ سامراجی نظام تعلیم و تربیّت ہے۔ اس کے علاوہ: لوٹ کھسوٹ میں بُری طرح ملوث نااہل سیاسی قیادت، بے لگن اَفسر شاہی، ریڈیو، ٹیلی وِژن اور صحافت میں بے مقصدیت اور سنسنی خیزی، مسجدوں میں انتشار وفساد کا دور دورہ، بدعنوانی اور رشوت جیسے عناصر نے بھی بچّوں کی بگڑتی ہوئی حالت میں بے حد گھناؤنا کردار ادا کیا۔ چناں چہ اب تو صورتِ حال یوں دکھائی دیتی ہے کہ بچّوں اور بڑوں کی موجودہ پود آیندہ شاذ ہی مِلّی سالمیّت، ترقّی اور احیاء کی کسی چھوٹی بڑی تحریک میں کسی قِسم کا کوئی حِصّہ لینے کی خواہش مندیا قابل رہی ہو۔

بچوں کے نام

ترتیب: عرفانہ یاسمین

کہا جاتا ہے کہ دانش مند قومیں مستقبل میں سرمایہ کاری کرتی ہیں' بیدار قومیں حال میں اور غافل قومیں ماضی میں۔ جو قوم اپنے وسائل' توانائیاں اور وقت ماضی کے تذکرہ پر خرچ کرتی ہے وہ گویا ماضی میں سرمایہ کاری کرتی ہے۔ جو اپنے وسائل اور توانائیاں درپیش مسائل کو حل کرنے پر صرف کرتی ہے' وہ حال میں سرمایہ کاری کرتی ہے۔ اور جو اپنے وسائل مستقبل کی صحیح منصوبہ بندی اور مستقبل کی تعمیر پر صرف کرتی ہے وہ مستقبل میں سرمایہ کاری کرتی ہے۔

مستقبل کی سرمایہ کاری قوم کے بچّوں کی تعلیم و تربیت ہے۔ جو قوم اپنے وسائل اپنے بچّوں کے لیے بہترین تعلیمی ادارے' بہترین اساتذہ' بہترین نصاب اور بہترین تعلیمی ماحول فراہم کرنے پر صَرف کرتی ہے' وہ گویا اپنے مستقبل کو روشن بنانے کی سعی کرتی ہے۔

آج پاکستان کا جو نقشہ ہمارے سامنے ہے' یہ وہ نہیں جو قائدِاعظمؒ اور علامہ اقبالؒ کے سامنے تھا۔ بدعنوان عناصر نے سادہ لوح عوام کو رشوت' مہنگائی' لوٹ کھسوٹ اور چھینا جھپٹی کرتے ہوئے بے وقوف بنایا مگر تعلیمی بجٹ میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ ان کو یہ بھی علم نہ تھا کہ:

قوم کے کتنے فی صد بچّوں کو مُناسب خوراک نہیں ملتی' کتنے فی صد بچّوں کے لیے اسکول مہیّا نہیں ہیں' کتنے فی صد بچّوں کو پینے کا صاف پانی نہیں ملتا' کتنے فی صد بچّوں کو علاج معالجے کی سہولت میسّر نہیں' کتنے فی صد بچّے اپنے بلکہ اپنے والدین کے پیٹ پالنے کے لیے محنت مزدوری کرتے ہیں۔

پیارے بچّو' آپ کو معلوم ہے کہ قائدِاعظمؒ بچّوں اور نوجوانوں کو کتنی اہمیّت دیتے تھے۔ علامہ اِقبالؒ نے بھی نوجوانوں ہی سے زیادہ اُمیدیں وابستہ کیں اور اُن سے بطورِ خاص مخاطب ہوئے۔ اگر آپ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ آج قوم کے غم میں تقریریں کرنے والوں میں مخلص کون ہے تو آپ اُن سے براہ راست یا اپنے والدین اور بزرگوں کے ذریعے یہ پوچھیں کہ جب آپ حکم ران تھے یا اب ہیں تو آپ نے مستقبل میں کیا سرمایہ کاری کی؟ وہ اس کا گول مول جواب دیں گے' جھوٹ بولیں گے۔ لیکن پاکستان کے بچّوں کی اصل حالت آپ کے سامنے ہے۔ آپ تھوڑی سی کوشش کر کے خود ہی اس سوال کا جواب ڈھونڈ سکتے ہیں کہ کس حکم ران نے پاکستان کے مستقبل میں کیا سرمایہ کاری کی؟

پروفیسر ڈاکٹر مسکین حجازی

میری سب سے پہلی تحریر غالباً 1940ء یا 1941ء میں تعلیم و تربیت ہی میں شائع ہوئی تھی۔ یہ بڑا رنگا رنگ' دیدہ زیب' دل چسپ اور معلومات افزا پرچہ ہے۔ نئی پود کو ذہن کی کشادگی' دل کی وسعت اور نظر کی فراخی کی تعلیم دیتا ہے۔ بچّوں میں علم کی پیاس پیدا کرتا ہے اور اپنے خواب و خیال کو معرضِ تحریر میں لانے پر اُبھارتا ہے۔ اور دل نشین طریقوں سے اُن کی شخصیّت کی تعمیر اور کردار کی تشکیل میں حصّہ لیتا ہے۔

استحکامِ پاکستان کے لیے ہمیں مستحکم کردار کے درد مند لوگوں کی ضرورت ہے۔ جن میں فقر و غنا کی شان ہو۔ جو ظاہر و باطن میں امین و صادق ہوں۔ جو حُبُّ الوطنی کے جذبے سے سرشار ہوں۔ جن کا پیمان وفا عوامُ النّاس سے' خاکِ وطن سے اور اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسولؐ سے ہو۔ ہمیں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہیے۔ صحیح معنوں میں اپنے آپ کو آزاد' غیور اور خود کفیل قوم ثابت کرنا چاہیے۔

عزیز بچّو' آپ پاکستان کے فرزند ہیں۔ پاکستان کا مستقبل ہیں۔ آپ کو اپنے اِس خداداد وطن پر فخر کرنا چاہیے اور کسبِ کمال سے خود کو بھی اِس کے لیے باعثِ فخر بنانا چاہیے۔ خدا آپ کا حامی و ناصر ہو۔

عبدالعزیز خالد

آج کا پاکستان اخلاقی بگاڑ میں اِس قدر گھرا ہوا ہے کہ ہم سب پریشان ہیں۔ اگر ہم اس موذی مرض سے چھٹکارا حاصل کر لیں تو ایک بار پھر قابلِ تقلید پاکستان کی جانب رواں دواں ہو سکتے ہیں۔ اِس کے لیے حکومت کے ساتھ عوامی سطح پر انجمنیں بنائی جائیں جو اپنی مدد آپ کے تحت اپنے علاقے میں بہتری کی کوششیں کریں۔ باشعور طبقہ کو سب سے پہلے ناخواندگی کی جانب توجہ کرنی چاہیے۔ عدلیہ اور وُکلا کو بد عنوانی پر قابو پانے کے لیے انصاف کو فعال انداز میں آگے بڑھانا چاہیے۔

تعلیم و تربیت نے بڑی خاموشی اور آرام سے بچّوں کو اچھّے اچھّے سبق دیئے ہیں۔ جو اُن کے آج اور کل کام آئیں گے۔ تعلیم و تربیت پڑھنے والے بچّوں کو چاہیے کہ وہ پاکستان کی خوب سیر کریں۔ خوب دل لگا کر پڑھیں اور اپنے ماں باپ سے کہیں کہ وہ ان کو قیام پاکستان کی کہانی سنایا کریں۔

ایس۔ ایم ظفر

قیامِ پاکستان ایک زندہ قوم کا زندہ کارنامہ ہے۔ تاریخ ساز اور عہد آفرین کارنامہ ہے۔ ایثار و جاں فشانی کی نہایت تابناک روداد ہے۔ ایک نحیف و زار شخصیت جسے قائدِ اعظمؒ کہتے ہیں' وہ میرِ کارواں تھا۔ میرِ کارواں اپنے کارواں کو زندگی کی بلند' شفاف اور خوب صورت شاہراہوں پر لے آیا تھا۔ (میں نے اپنی آنکھوں سے اب تک کے تمام مراحل دیکھتے ہیں)

مگر پھر اس زندہ کارنامے پر ایسی گرد چھانے لگی کہ برابر بڑھتی ہی چلی گئی۔ اس گرد سے اپنے وطن عزیز کو پاک کرنے کی میرے نزدیک صرف ایک ہی تجویز ہے: افرادِ قوم 65ء کی جنگ کے دنوں اور راتوں کو اپنے دلوں کی گہرائیوں میں اُتار لیں۔ تمام لوگ ویسے بن جائیں جیسے اُس زمانے میں بن گئے تھے۔ قوم اپنے آپ کو اُن دنوں کے حوالے کردے۔ یہ دن قوم کو از سرِ نو زندہ و تابندہ بنا دیں گے۔

میں شروع ہی سے تعلیم و تربیت پڑھ رہا ہوں۔ ایک وقت ایسا بھی آیا تھا کہ میں خود عملاً اِس کی ادارت سے وابستہ تھا۔ یہ محض ایک پرچہ ہی نہیں ایک ادارہ ہے۔ ایک تربیت گاہ' ایک مکتب ہے۔ یہ پہلے بھی منفرد تھا اور اب بھی ہے۔ اس پرچے نے مستقل بچّوں کے اندر حُبّ الوطنی کے جذبے کی پرورش کی ہے۔ یہ ایک ایسا کردار ہے جو تعلیم و تربیت سے مختص ہو کر رہ گیا ہے۔ اسے ہر گھر میں ہونا چاہیے۔ یہ ہر گھر کے بچّوں کی ضرورت ہے۔

میرے پیارے بچّو! تم میں سے ہر ایک کو چاہیے کہ وہ بذاتِ خود تعلیم و تربیت بن جائے۔ تم میں سے ہر بچہ اس کاغذی روپ کو انسانی روپ دے دے۔ تم ایسے بن جاؤ کہ جو کوئی بھی تمہیں دیکھے فوراً" کہ دے یہ تو تعلیم و تربیت کا تربیت یافتہ ہے۔

میرزا ادیب

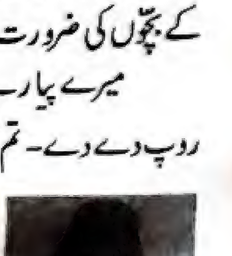

گذشتہ پچاس سال کے دوران میں ہمارا ملک بہت سے نشیب و فراز سے گزرا ہے اور تخلیقِ پاکستان کا مقصد ابھی تک پورا نہیں ہو سکا۔ چناں چہ اس مقصد کی تکمیل اور استحکامِ پاکستان کے لیے ضروری ہے کہ قوم میں آزادی کا صحیح شعور پیدا کیا جائے تاکہ وہ دنیا کی ترقی یافتہ قوموں کے شانہ بشانہ کھڑے ہو کر عزت و وقار کا مقام حاصل کر سکیں۔ اِس غرض کے لیے ضروری ہے کہ تعلیم و تربیت کے ذریعے پاکستان کے باشندوں کو اچھا مُسلمان اور اچھا پاکستانی بنانے پر خصوصی توجہ دی جائے۔ کیوں کہ اخلاقی ترقی کے بغیر مُسلمان محض مادی ترقی کر کے اپنے صحیح مقام کو نہیں پا سکتا۔ اور نہ اُسے اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت حاصل ہو سکتی ہے۔

میں اپنے نو عمر اور نوخیز عزیزوں سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ وہ محنت اور لگن کے ساتھ حصولِ علم پر اپنی توجہ مرکوز رکھیں اور وقت ضائع کرنے والی دل چسپیوں سے گریز کر کے اپنا رِشتہ کتاب کے ساتھ جوڑیں۔ تاکہ وسیع مطالعہ سے ان کا ذہن وسیع اور روشن ہو اور سچّی علمی لگن کے نتیجہ میں وہ پاکستان کے مفید شہری اور قائدانہ صلاحیتوں والے نوجوان بن سکیں۔ نیز تاریخِ اسلام اور دین و مذہب کا علم بھی شوق سے حاصل کریں۔ تاکہ وہ مُسلمان اور صاحبِ کردار انسان بھی بن سکیں۔

حفیظ الرحمان احسن

آئیے مسکرائیں

☆ ایک شخص چھت سے گر کر دونوں ٹانگیں تڑوا بیٹھا۔ ایک دوست عیادت کرنے گیا اور بار بار یہی کہتا رہا "سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہاری دونوں ٹانگیں کیسے ٹوٹ گئیں؟"
دوست نے جل کر کہا: چھت سے گر کر دیکھو۔ فوراً" سمجھ جاؤ گے۔ (محمد خالد رمضان، قادر پورراں)

☆ پہلا دوست (کم زور نظر والے دوست سے): تم یہ عینک نہ پہنا کرو یہ پہن کر تم لنگور لگتے ہو۔
کم زور نظر والا دوست: اگر میں یہ عینک اتار دوں تو پھر مجھے تم لنگور معلوم ہوتے ہو (افشاں سعید، خانقاہ ڈوگراں)

☆ ایک دوست (دوسرے سے): میں کبھی بیمار نہیں ہوا اور حقیقت تو یہ ہے کہ ہمارے محلے میں بیماری نام کی کوئی چیز ہے ہی نہیں۔ کبھی کوئی بیمار ہوا ہی نہیں۔
دوسرا دوست: یار کیوں جھوٹ بول رہے ہو۔ ابھی کل میں نے تمہارے محلّے میں ایک مریل اور بیمار سا آدمی دیکھا ہے۔
پہلا دوست: دراصل وہ ہمارے محلّے کا ڈاکٹر ہے (محمد طاہر سلیم، پل دولے والا قصور)

☆ فوج کے جرنیل نے اپنے سپاہی سے پوچھا "تم نے اس جنگ میں کیا بہادری دکھائی"۔
سپاہی: جناب، میں نے ایک شخص کا ہاتھ کاٹ ڈالا۔
جرنیل: ہاتھ کاٹنے سے کیا حاصل ہوا۔ سر کیوں نہیں کاٹا؟
سپاہی: جناب وہ تو پہلے ہی کٹا ہوا تھا (عابد علی، چیچہ وطنی)

☆ بیٹا باپ سے: شام کے دارلحکومت کا کیا نام ہے؟
باپ: پتا نہیں۔
بیٹا: روس کے دارلحکومت کا؟
باپ: پتا نہیں۔
بیٹا: اچھا یہ بتائیں کہ، چلیں رہنے دیں۔
باپ: پوچھو بیٹا، پوچھو۔
بیٹا: نہیں رہنے دیں۔
باپ: پوچھو، پوچھو۔ پوچھنے سے معلومات بڑھتی ہیں۔ (آمنہ فیاض، اسلام آباد)

☆ پہلا دوست: میرا بخار اترنے کا نام ہی نہیں لے رہا۔
دوسرا دوست: یار تیرا قد اتنا لمبا ہے اسے اترتے میں آخر کچھ وقت تو لگے گا ہی۔ (سید عمر گیلانی، گوجرانوالہ)

نام ور لوگ

Sharjeel Ahmed

سردار عبدالرّب نشترؒ

الیاس نظامی

شام ہونے کو ہے۔ گورنر پنجاب باغِ جناح (لاہور) میں ٹہل رہے ہیں۔ نہ کوئی محافظ' نہ کوئی خدمت گار۔ ایک بچّہ اپنی بائی سِکل سمیت اِن سے ٹکرایا اور گر گیا۔ بچّہ گورنر صاحِب کو دیکھ کر گھبرا گیا۔ لیکن گورنر صاحِب نے اُسے پیار کرتے ہوئے اُٹھایا اور کہا "بیٹا کسی اور سے نہ ٹکرانا ورنہ پٹائی ہو جائے گی"۔ ایسے شفیق اور مہربان گورنر کا نام یقیناً آپ جاننا چاہتے ہوں گے۔ یہ سردار عبدالرّب نشترؒ ہیں۔

پاکستان کے قیام اور پھر اس کے استحکام کے لئے جن مسلم راہ نماؤں نے قابلِ قدر خدمات انجام دیں' اِن میں سردار عبدالرّب نشترؒ کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ سردار نشترؒ 13 جون 1899ء کو پشاور کے ایک پڑھے لکھے اور دین دار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام عبدالحنّان خان تھا۔ چوں کہ شروع ہی سے دینی ماحول میسر آیا۔ اِس لیے ساری زندگی اچھے اور سچے مسلمان کی طرح بسر کی۔ آپؒ میں اعلیٰ اخلاقی اوصاف کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔

اِبتدائی تعلیم مِشن ہائی اسکول' پشاور سے حاصل کی۔ میٹرک کا امتحان 1914ء میں سناتن دھرم ہائی اسکول سے پاس کیا اور ایڈورڈز کالج پشاور سے ایف اے کیا۔ پنجاب یونی وَرسٹی سے بی اے پاس کرنے کے بعد قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے آپؒ نے ایم اے او کالج (علی گڑھ) میں داخلہ لے لیا۔

1925ء میں درجہ دوم کے وکیل کا لائسنس حاصل کیا۔ اپنی محنت' دیانت اور شرافت کے باعث آپ کا شمار جلد ہی پشاور کے ممتاز وکلا میں ہونے لگا۔ اس زمانے میں تحریکِ خلافت زوروں پر تھی۔ یہ تحریک مسلمانانِ ہند نے انگریزوں کے خلاف' عثمانی خلافت کے حق میں چلائی تھی۔ نواجون نشتر نے اِس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس دور میں انگریزوں سے ٹکر لینا کوئی آسان کام نہ تھا۔ آزادی کا مطالبہ کرنے والوں کو خوف ناک سزاؤں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ مگر سردار عبدالرّب نشترؒ نے کسی خطرے کو دل میں جگہ نہ دی۔

آپؒ 1929ء میں بلدیہ پشاور کے رُکن منتخب ہوئے اور چار سال تک اس ذمّہ داری کو نبھایا۔ تحریکِ خلافت کے زمانہ میں سردار نشترؒ آزادی کا سچّا جذبہ لے کر کانگرس میں شامل ہوئے مگر کانگرس کی مُسلم دُشمنی جلد ہی آپؒ پر واضح ہو گئی۔ لہٰذا آپؒ 1931ء میں اِسے چھوڑ کر مُسلم لیگ میں شامل ہوگئے اور 1937ء کے صوبائی انتخابات میں بھاری اکثریت سے اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔

1940ء میں قرار دادِ پاکستان لاہور میں منظور ہوئی۔ اب مسلمانانِ ہند کی منزل واضح ہوگئی تھی۔ سردار نشترؒ نے اپنے آپ کو پاکستان حاصل کرنے کی جدّوجہد کے لئے وقف کر دیا۔ جب صوبہ سرحد میں کانگرس کی صوبائی وزارت ختم ہوئی تو 1943ء میں سردار اورنگ زیب خان کی قیادت میں مُسلم لیگ نے اپنی حکومت قائم کر لی۔ نشترؒ اِس حکومت کے وزیرِ خزانہ مقرر ہوئے۔

قائدِاعظمؒ کو آپؒ کی سیاسی سوجھ بوجھ پر بڑا اعتماد تھا۔ چناں چہ 1944ء میں آپؒ کو آل انڈیا مسلم لیگ کی

مجلسِ عاملہ کا رُکن چُن لیا گیا۔ یہ دوسری جنگِ عظیم کا زمانہ تھا اور وقت جُوں جُوں گزرتا جا رہا تھا، تحریکِ آزادی کی شِدّت میں توُں توُں اضافہ ہو رہا تھا۔ اِن حالات میں برِصغیر کے سیاسی مسائل کے حل کی غرض سے 1945ء میں، حکومت نے شملہ کے مقام پر ایک کانفرنس طلب کی۔ اِسے شملہ کانفرنس کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اِس میں مُسلم لیگ، کانگریس، اقلیتیں اور حکومت کے نمایندے شریک ہوئے۔ سردار عبدالرّب نشترؒ اُن گنے چُنے مُسلم نمایندوں میں سے ایک تھے جنہوں نے قائداعظمؒ کے ساتھ کانفرنس میں شرکت کی۔

شملہ کانفرنس میں سوائے انتخابات کے کِسی نکتے پر اتفاق نہ ہو سکا۔ چناں چہ جب مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات منعقد ہوئے تو سردار عبدالرّبؒ مرکزی اسمبلی کے رُکن منتخب ہوئے۔ مُسلم لیگ نے پاکِستان کے نام پر اِنتخابات میں حصہ لیا تھا۔ جِس کے جواب میں مرکزی اسمبلی کی تیس کی تیس مُسلم نِشستیں مُسلم لیگ کے ہاتھ رہیں۔ یہ اس بات کا مُنہ بولتا ثبوت تھا کہ اب مُسلمان ہِندو اور انگریز دونوں کی غلامی سے نجات پانے کے لئے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بَن چکے ہیں۔

1946ء میں متحدہ ہِندوستان کی کابینہ بنی تو سردار عبدالرّبؒ وزیرِ مواصلات مقرر ہوئے۔ 3 جون 1947ء کو وائسرائے ہند، لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے متحدہ ہِندوستان کی آزادی اور اس کی تقسیم کے منصوبے کا اعلان کیا۔ اس منصوبے کے تحت صوبہ سرحد میں ریفرنڈم کے ذریعے یہ بھی معلوم کرنا تھا کہ آیا یہاں کے عوام پاکِستان کا حِصّہ بننا چاہتے ہیں یا ہِندوستان کا۔ قائدِاعظمؒ کے کہنے پر سردار عبدالرّبؒ نے رائے عامہ پاکِستان کے حق میں ہموار کرنے کے لئے پورے صوبے میں جلسوں اور رابطوں کا ایک جال بچھا دیا۔ اللہ تعالیٰ نے آپؒ کی محنت قبول کی اور سرحد کے عوام نے بھاری اکثریت سے پاکستان کے حق میں فیصلہ دیا۔

14 اگست 1947ء کو جب پاکستان وجود میں آیا تو اب اِس کی تعمیر اور استحکام کا مسئلہ تھا۔ بیسیوں مسائل مُنہ کھولے کھڑے تھے۔ اِن میں ایک بڑا مسئلہ بھارت سے آنے والے لاکھوں لُٹے پُٹے مہاجرین کی آبادکاری کا تھا۔ نشترؒ اس وقت پاکستان کے وزیرِ مواصلات تھے۔ اُنہوں نے مہاجرین کی آمدورفت اور آبادکاری میں بے شمار آسانیاں پیدا کیں۔

قائداعظمؒ کی وفات کے بعد 1949ء میں آپؒ پنجاب کے گورنر مقرر ہوئے۔ اس عہدے پر فائز ہوتے ہی آپؒ نے گورنر ہاؤس کے دروازے عوام النّاس کے لئے کھول دیئے، ہر شخص بغیر کسی رکاوٹ کے آپؒ سے ملاقات کر سکتا تھا۔ آپؒ بڑی خندہ پیشانی سے لوگوں کے مسائل سنتے اور حل کرتے۔ نشترؒ صرف دو سال گورنر رہے مگر آپؒ نے اس عرصے میں بہت نیک نامی حاصل کی۔

1951ء میں آپؒ دوبارہ مرکزی وزیر مقرر ہوئے۔ اب صنعت و حرفت کا محکمہ آپؒ کے سپرد کیا گیا۔ لیکن 1954ء میں جب خواجہ ناظم الدّین کی وزارت ختم ہوئی تو آپؒ بھی فارغ ہو گئے۔

سردار نشترؒ کو اُردو سے بُہت محبّت تھی۔ آپؒ کی گورنری کے دور میں پہلی بار پنجاب کا صوبائی بجٹ اُردو زبان میں پیش کیا گیا۔ اُردو کو سرکاری اور دفتری زبان بنانے کے سلسلے میں بھی آپؒ نے قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔ آپؒ نہ صرف ایک مدبّر اور انصاف پسند سیاست دان تھے بلکہ بہت اچھے شاعر بھی تھے۔ آپؒ کا ایک مشہور شعر ہے۔

ﻉ بس اتنی سی خطا پر راہبری چھینی گئی ہم سے
کہ ہم سے قافلے منزل پر لٹوائے نہیں جاتے

آپؒ نے 14 فروری 1958ء کو وفات پائی اور عوام کے پرزور اصرار پر آپؒ کو مزارِ قائدِاعظمؒ کے احاطے میں دفن کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ آپؒ کے درجات بلند فرمائے۔ (آمین)

جاوید امتیازی

بچو! ایک پہیلی بوجھو

پاکیزہ ہے وہ اتنا
پھول گلاب ہو جتنا

اُس کے چار ہیں بازو بچو!
ہر سو اُس کی خوش بو بچو!

کتنا پیارا پیارا وہ
کتنا راج دلارا وہ

سونا پہنے، چاندی پہنے
ڈھیروں اُس کے ہیں گہنے

توقیر[1] میں وہ ہے لاثانی
بات یہ سب نے ہے مانی

اللہ کے احسان ہیں اُس پر
ہم سارے قربان ہیں اُس پر

نگر نگر اُس کے اجیارا[2]
جو بوجھے، کہلائے پیارا

1- عزت- احترام 2- روشنی

☆ ہر شعر کا پہلا حرف ملائیں تو جواب مل جائے گا

بالکل سچی

نجمہ معراج

یہ 1961ء کا واقعہ ہے۔ موسمِ بہار کی ایک سہانی رات تھی۔ مٹھو کی امی گہری نیند سوئی ہوئی تھیں۔ اچانک اُن کی آنکھ کھل گئی۔ مٹھو جو موت کے منہ سے بچا تھا' اُس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اِس کے سوا دنیا میں اُس کا کوئی بھی تو نہیں تھا۔ دونوں ماں بیٹا ایک بوڑھے دُکان دار کے گھر رہتے تھے۔ مٹھو نے آج نویں جماعت میں داخلہ لینے کے لیے شہر جانا تھا۔ وہ پہلے گاؤں کے اسکول میں ہی پڑھتا تھا جو صِرف آٹھویں جماعت تک تھا۔ وہ اپنے اسکول میں اوّل آیا تھا۔

مٹھو کی ماں نے آنکھ کھُلتے ہی کلاک کی طرف دیکھا۔ تین بج چکے تھے —— وہ جلدی سے اُٹھی اور آفتابہ پکڑا۔ یہ وہ رات کو ہی بھر کر رکھ لیا کرتی تھی کہ صبح نل چلانے سے دوسروں کی نیند خراب نہ ہونے پائے۔ اُس نے وضو کیا اور نمازِ تہجّد ادا کی پھر تسبیح لے کر چارپائی پر بیٹھ گئی۔ آج اُس کا دل خوش تھا کہ اُس کا بیٹا اب ہائی اسکول میں جائے گا۔ اُس کی نظر مٹھو کے چہرے پر پڑی جو پاس ہی چارپائی پر سو رہا تھا اور پھر وہیں جمی کی جمی رہ گئی۔ نہ جانے کِس وقت تسبیح بھی اس کے ہاتھ سے چھُوٹ گئی۔

آج سے 14 سال پہلے پیش آنے والا واقعہ اُس کے ذہن میں فِلم کی طرح گھومنے لگا تھا۔ اس وقت ابھی پاک و ہند علیحدہ نہیں ہوئے تھے۔ مٹّھو کے دادا کا گور داس پور شہر میں بہت بڑا مکان تھا جو افرادِ خانہ سے بھرا ہوتا تھا۔

مٹھو کی تین پھوپھو' ایک تایا اور اُس کے چھ بچّے' تائی امّاں' دادی امّاں' دو چاچو' مٹّھو کا ایک بھائی اور بہن' ابّا جان اور دو نوکرانیاں' یہ سب اُسی گھر میں رہتے تھے۔ سارا دن رونق لگی رہتی تھی۔ ایک رات اچانک ایک طرف سے چیخ پکار سنائی دینے لگی۔ پتا کرنے پر معلوم ہوا کہ پاک و ہند کے علیحدہ ہو جانے کی وجہ سے سِکھ اور ہندو مُسلمانوں کو اِس علاقے سے زبردستی نکال رہے ہیں۔ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے مٹھو کے دادا ابّو نے کہا ”سب مال اسباب یہیں چھوڑ کر گھر سے نکلو۔ تاکہ جتنی جلدی ممکن ہو پاکستان چلیں“۔

بھَرا پُرا گھر چھوڑ کر سب بچّے' بوڑھے اور جوان پاکِستان کو اپنی منزل بنا کر گھر سے چل پڑے۔ شہر سے نکل کر وہ ابھی کچھ ہی دور گئے تھے کہ سِکّھوں کا ایک جتّھا آ گیا۔ سکّھوں نے جب دیکھا کہ یہ مُسلمان ہیں تو اُنھوں

نے سب کو بڑی بے دردی سے مارنا پیٹنا شروع کر دیا۔ اِن ظالموں پر عورتوں اور بچّوں کی چیخ پکار کا بھی کوئی اثر نہ ہوا۔ مِٹھو کی پیاری سی بہن مدیحہ کے پیٹ میں جب ایک سِکھ نے بَرچھی بھونک کر باہر نکالی تو خون کا ایک فوّارہ اس کے منہ پر جا گرا اور وہ تڑپتی ہوئی کہ رہی تھی "اللہ میاں مجُھے بچا لو' اللہ میاں مجُھے بچا لو"۔ یہ آوازیں مِٹھو کی ماں کو دور تک سنائی دے رہی تھیں۔ مگر وہ مسلسل بھاگتی رہی۔

وہ سب سے پیچھے تھی۔ اسے آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں اور بڑی درد ناک محسوس ہو رہی تھیں۔ مِٹھو کی عُمر ابھی صرف تین ماہ تھی اور اس کی ماں اسے اٹھائے ہوئے بھاگ رہی تھی۔ابھی وہ ایک کِلو میٹر ہی دَوڑ پائی تھی کہ اُسے ایک سِکھ نے پکڑ لیا۔ اُس نے اپنے ایک ساتھی سے کہا "جاؤ اس کو میرے گھر چھوڑ آؤ"۔

وہ اُسے کافی دور اُس سِکھ کے گھر چھوڑ آیا۔ سِکھ کی بوڑھی ماں نے اُسے کھانا کھلایا پھر اپنی بہو کے پاس لے گئی اور کہا "مِیری' میرے کمرے کے پاس جو چھوٹا سا کمرا ہے۔ اسے وہاں لے جاؤ اور بِستر بھی دے دو"۔ چناں چہ مِیری نے ایسا ہی کیا۔ رات کے تقریباً" دس بجے گھر کا دروازہ کسی نے پورے زور سے دَھڑ دھڑایا۔ بوڑھی امّاں پاؤں گھسیٹتے ہوئے آہستہ آہستہ دروازے تک پُہنچی اور کہا "کون ہے؟"

باہر سے آواز آئی "تیرا بیٹا' راجو"۔

"راجو آ گئے ہو" جونہی راجو اندر آیا اس کی ماں نے پوچھا "راجو بیٹا' وہ عورت کون ہے؟"

راجو بولا "ماں وہ تو میں نے آپ کے لیے نوکرانی بھیجی ہے۔ آپ سے گھر کا کام نہیں ہوتا ناں۔ اب گھر کا سارا کام اس سے کرایا کرو"۔

مِٹھو کی ماں ایک ماہ سے راجو کے گھر میں کام کر رہی تھی۔ وہ ہر کام بہت احسن طریقے سے کرتی اور رات کو سب گھر والوں سے چوری چھپے نماز ادا کرتی۔ مِٹھو بھی اس وقت گہری نیند سو چکا ہوتا تھا۔ آج صبح امّاں نے اپنی بہو سے کہا "مِیری' مِٹھو کی امّی سے کہو کہ جھاڑو دینے کے بعد گندم صاف کرے۔ میں لحاف اور روئی چھت پر چھوڑ آئی ہوں وہ جب گندم صاف کر لے تو اُسے کہنا کہ لحاف میں روئی ڈال کر شام تک رضائی سی دے"۔

گندم صاف کرنے کے بعد وہ لحاف میں روئی ڈالنے کے لیے جب چھت پر گئی تو اپنے ساتھ مِٹھو کو بھی لے گئی۔ وہ ہر صورت پاکستان پہنچنا چاہتی تھی۔ مگر اب ان لوگوں کی قید سے رہائی حاصل کرنے کی کوئی ترکیب اس کے ذہن میں نہیں آ رہی تھی۔ پھر اچانک اُسے خیال آیا کہ کیوں نہ آج چھت سے چھلانگ لگا کر بھاگ نکلے۔

اُس نے جلدی سے مِٹّھو کو روئی میں لپیٹا۔ پھر اللہ کا نام لے کر گھر کی پچھلی طرف خالی جگہ میں' جہاں گھاس اُگی ہوئی تھی' مِٹّھو کو چھت سے نیچے گرا دیا۔ پھر خود بھی لحاف والا کپڑا اوڑھ کر نیچے چھلانگ لگا دی۔ نیچے گھاس پر گِرنے کی وجہ سے اُسے کوئی خاص چوٹ نہ آئی۔ اس نے جلدی سے مِٹّھو کو اُٹھایا اور یہ دیکھے بغیر کہ روئی میں لپٹا ہوا بچّہ زندہ بھی ہے یا نہیں' وہاں سے بھاگ نکلی۔ بہت دُور جا کر وہ درختوں میں چھُپ کر بیٹھ گئی۔ اُس نے مِٹّھو کے مُنہ سے کپڑا ہٹا کر دیکھا تو وہ گول گول چمک دار آنکھیں کھول کر اپنی ماں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اتنے ڈر' خوف اور پریشانی کے باوجود مِٹّھو کو زندہ دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ آ گئی۔ اسے شدید پیاس لگی ہوئی تھی۔ حلق بری طرح خشک ہو رہا تھا۔ درختوں کے قریب ایک گڑھے میں پانی کھڑا تھا۔ وہاں سے اس نے تھوڑا سا پانی پیا پھر مِٹّھو کو دودھ پلایا۔ اور بلا سوچے سمجھے ایک جانب سفر شروع کر دیا۔ اس کے دماغ میں اب یہ خوف تھا کہ کہیں وہ بھارت میں ہی تو بھٹکی ہوئی نہیں ہے۔ لمبا سفر طے کرنے کے بعد جب دریا نظر آیا تو اس کی کچھ ڈھارس بندھی کہ وہ پاکستان پہنچ رہی ہے۔ کیوں کہ اسے یہ علم تھا کہ یہ دریائے راوی ہے اور اس

کی دوسری جانب پاکستان ہے۔ راوی کے کنارے پر ایک مچھیرا کھڑا تھا۔ وہ اس کی طرف دیکھ کر سہم گئی کہ کہیں یہ بھی سکھ یا ہندو ہی نہ ہو۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ اس نے قریب آ کر پوچھا ''بی بی، آپ دریا کی دوسری طرف جانا چاہتی ہیں؟''

''ہاں بھائی، ہاں'' اس نے جلدی سے کہا۔

''میرے پیچھے پیچھے آؤ'' اس نے کہا اور وہ اسے ایک کشتی کے قریب لے گیا۔ یہاں اور بھی کچھ لوگ کھڑے تھے۔ مچھیرے نے انہیں کہا کہ اس عورت کو بھی دوسرے کنارے پر پہنچا دو۔ انہوں نے مٹھو کی ماں کو بھی کشتی میں بٹھا لیا اور دوسرے کنارے پر اُتار دیا۔ مٹھو اس کے پاس تھا اور وہ اب پاکستان پہنچ چکی تھی۔ پاک سر زمین کو دیکھ کر اسے بہت خوشی ہوئی۔ اُس کا دل چاہتا تھا کہ اِس کی مٹی کو چوم لے۔ خیر مٹھو کو اُٹھائے وہ سفر کرتی رہی یہاں تک کہ آگے آبادی آ گئی۔ اس کا بھوک اور پیاس سے برا حال ہو رہا تھا۔ مٹھو کے لیے دودھ بھی نہیں آ رہا تھا۔ رو رو کر اُس کا حلق بھی اب خشک ہو گیا تھا۔ اِس آبادی میں اسے ایک دکان نظر آئی جس میں ایک آدمی بیٹھا تھا۔ آدمی کی ڈاڑھی اور سر کے بال آدھے سفید اور آدھے سیاہ تھے۔ وہ جلدی سے دکان کے آگے جا کر کھڑی ہو گئی اور دکان دار سے کہنے لگی ''تایا جی، میرے بچّے کے لیے تھوڑا سا پانی مل سکتا ہے۔ یہ بھوک کے مارے دم توڑ رہا ہے''۔

ساتھ ہی اس نے بے اختیار رونا شروع کر دیا۔ دُکان دار کے گھر سے روٹی اور دودھ آیا تھا۔ اُس نے جلدی سے دودھ مٹھو کی ماں کو دیا۔ عورت نے مٹھو کو پلانا شروع کیا۔ دودھ پی کر مٹھو کچھ سنبھلا تو دُکان دار نے کھانا کھول کر اس عورت کے آگے رکھ دیا۔ اس کی تو پہلے ہی مارے بھوک کے جان نکل رہی تھی۔ وہ کچھ بولے بغیر کھانے کی طرف یوں بڑھی جیسے کئی سالوں سے بھوکی ہو۔ پھر اُس نے جلدی جلدی آدھے سے کچھ زیادہ کھانا کھا لیا۔ اس کا جی تو چاہتا تھا کہ سارا کھانا ہڑپ کر جائے مگر اُس نے کہا ''تایا جی آپ کی بہت مہربانی'' اور باقی کا کھانا ان کی طرف بڑھا دیا۔ اب اس نے یہاں سے جانے کے لئے مٹھو کو گود میں اُٹھا لیا۔ دُکان دار نے جب یہ دیکھا تو کہنے لگا ''بی بی! اس حال میں کہاں جا رہی ہو؟'' مٹھو کی ماں نے اسے سارا واقعہ سنایا اور کہا کہ میں مٹھو کے والد

اور اپنے باقی عزیزوں کو ڈھونڈنا چاہتی ہوں۔ دُکان دار نے کہا "بی بی' آپ میرے گھر رہنا چاہیں تو رہ لیں۔ جیسی میری بیٹی ویسی آپ۔ اس پریشانی میں بچّے کو کہاں لیے پھرو گی۔ تم میرے پاس رہو۔ جب بھی تمھارے عزیز رشتے دار مل جائیں' تم ان کے ہاں چلے جانا۔ میں بھی ان کی تلاش جاری رکھوں گا"۔

مِٹھو کی ماں نے دُکان دار کی بات مان لی۔ دُکان دار نے دُکان بند کی اور اُسے گھر لے گیا۔ دُکان دار کی ایک بیٹی اور ایک بیوی تھی۔ اُس نے ان کو مِٹھو اور اس کی ماں کے متعلق سب کچھ بتا دیا اور کہا کہ جب تک ان کے گھر والے مِل نہیں جاتے یہ ہمارے گھر میں رہیں گے۔ وہ دن اور آج کا دن وہ اِسی گھر کے ہو کر رہ گئے۔ اُس کے گھر والوں نے نہ ملنا تھا نہ ملے۔ اس کا بیٹا مِٹھو' نویں جماعت میں ہو گیا لیکن ابھی تک ان کے افرادِ خانہ کا کوئی سراغ نہ ملا۔ البتہ تایا جی اور ان کے گھر والوں نے کبھی نہ سوچا کہ یہ دونوں ماں بیٹا ہم پر بوجھ بنے بیٹھے ہیں۔ مِٹھو کی امّی کبھی دُکان دار سے کہتی "تایا جی' مجھے بھی سلائی وغیرہ کا کام باہر سے لا دیا کرو۔ ہم لوگ کب تک آپ پر بوجھ بنے رہیں گے"۔ تو تائی اماں کہتیں "بیٹی آیندہ کبھی ایسا نہ کہنا۔ آپ کے تایا کو اللہ سلامت رکھے' وہ کماتے کس لیے ہیں۔ فہمیدہ تو اپنے گھر کی ہو گئی ہے۔ اب ہمارے لیے تو تم ہی سب کچھ ہو۔ تم ہماری فہمیدہ اور مِٹھو ہمارا بیٹا ہے"۔

مِٹھو روزانہ تایا جی کے ساتھ دکان پر چلا جاتا اور اُن کا ہاتھ بٹاتا۔ وہ دُکان دار کو نانا جی کہتا تھا۔ سب لوگ یہی سمجھنے لگے تھے کہ اُس کا نواسا ہے۔

اچانک مِٹھو کی ماں کی نظر کلاک پر پڑی تو چھ بج چکے تھے۔ وہ ماضی کی یادوں میں اِس قدر کھو گئی تھی کہ اسے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں رہا تھا۔ اس نے مِٹھو کو جلدی سے اٹھایا اور کہا "بیٹا' آج آپ نے ہائی اسکول میں جانا ہے۔ جلدی سے اُٹھو' ناشتا کرو اور کپڑے بدلو۔ مِٹھو سات بجے تک ناشتا کر کے اسکول روانہ ہو گیا اور اُس کی ماں اپنے بیٹے کی کام یابی کے لیے دُعا کرنے لگی۔

شام کو مِٹھو اسکول سے آیا تو بہت پریشان تھا۔ اُس کی ماں نے اُس سے پریشانی کی وجہ پوچھی تو اس نے اُسے کچھ نہ بتایا۔ جب اُس نے بہت اصرار کیا تو وہ رو دیا اور کہنے لگا کہ امّی جب میں اسکول پہنچا تو ہیڈ ماسٹر صاحب نے مجھے داخل کر لیا۔ میں اپنی جماعت میں چلا گیا۔ تیسرا پریڈ انگریزی کا تھا۔ انگریزی کے ماسٹر صاحب ہماری جماعت میں داخل ہوئے تو انھوں نے آتے ہی کہا کہ نئے آنے والے لڑکے کھڑے ہو جائیں۔ میں بھی کھڑا ہو گیا۔ اُنھوں نے سب سے ان کا نام اور والد کا نام پوچھا۔ جب مجھ سے پوچھا گیا تو میں نے کہا مُحمّد احمد ولد نذر محمّد۔ تو اُنھوں نے پوچھا بیٹا' آپ کی ماں کا نام کیا ہے؟ تو امّاں مجھے بہت

غصّہ آیا۔ پہلی مرتبہ تو میں نے خاموشی اختیار کی۔ لیکن جب اُنھوں نے دوبارہ یہی پوچھا تو پھر میں نے کہ ہی دیا کہ آپ کو میری ماں کے نام سے کیا؟ تو سب لڑکے ہنس پڑے۔ امّاں میں کل سے اسکول نہیں جاؤں گا" مِٹھو یہ کہ کر رونے لگا۔ اس کی ماں نے پوچھا "بیٹے' اُن ماسٹر صاحب کا نام کیا ہے؟"

"امّاں' ان کا نام بھی نذر ہی ہے" مٹھو نے کہا تو اس کی ماں سوچ میں پڑ گئی۔

"مِٹھو' کل مجھے اپنے ساتھ اسکول تک لے جانا اور باہر سے مجھے اپنے ماسٹر صاحِب دکھانا" اُس نے مِٹھو سے کہا۔

اگلے دن مِٹھو اور اس کی ماں اسکول گئے۔ مِٹھو نے ابھی اپنی امّی کو اسکول کے گیٹ پر کھڑا ہونے کے لیے کہا ہی تھا کہ تھوڑی دور سے ایک آدمی آتا ہوا دکھائی دیا۔ مِٹھو بولا "امّی جان' وہ ہیں ماسٹر نذر صاحِب"۔ مِٹھو کی ماں نے اُنہیں فوراً پہچان لیا۔ یہ مِٹھو کے والد ہی تھے جو پاکِستان کی طرف ہجرت کے دوران میں اُن سے بچھڑ گئے تھے۔"مِٹھو تمھارے ابّو مل گئے' تمھاری قِسمت جاگ گئی۔ جاؤ اُن سے کہو کہ میری ماں کا نام ثمینہ ہے اور وہ باہر کھڑی ہے"۔ ثمینہ کی آنکھوں میں مارے خوشی کے آنسو آگئے تھے۔

مِٹھو اسکول کے اندر گیا اور جھجکتے ہوئے ماسٹر صاحِب سے کہنے لگا "ماسٹر جی' میری ماں کا نام ثمینہ ہے اور وہ باہر اسکول کے گیٹ کے قریب کھڑی ہیں"۔ ماسٹر صاحب جلدی جلدی قدم اُٹھاتے ہوئے گیٹ کے پاس پہنچے اور بے اختیار منہ سے نکل گیا "آپ ثمینہ ہو"۔

مِٹھو کی ماں نے چہرے سے پلّو ہٹا کر کہا "ہاں میں ثمینہ ہی ہوں' آپ کی بیوی اور یہ رہا آپ کا بیٹا محمّد احمد۔ آپ کہاں تھے اور باقی لوگ کہاں ہیں۔ اس کے دادا' دادی' بوا' آپا' رقیہ' نصرت' نعیم' نوید اور سب بچّے کہاں ہیں؟ ہمیں بھی لے چلو اُن کے پاس۔ کہاں ہیں وہ

سب"۔ اس نے یہ سب کچھ ایک ہی سانس میں پوچھ لیا۔

ثمینہ کے یہ سب سوال سن کر مِٹھو کے ابّا جان رو پڑے اور مِٹھو کو جلدی سے گلے لگا لیا۔ ثمینہ نے مِٹھو کا بازو مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا اور ابّا جان اُسے گلے لگا کر روئے جا رہے تھے۔ مِٹھو کو بھی رونا آگیا۔ پھر اُنھوں نے مِٹھو کو چھوڑ کر آنسو صاف کرتے ہوئے کہا "ثمینہ' گھر کا تو کوئی فرد نہ بچ سکا۔ سب کو ہِندوؤں اور سِکھوں نے پاکستان پہنچنے سے پہلے ہی ختم کر دیا تھا۔ بس میں، آپ اور مِٹھو ہی وہاں سے بچ بچا کر پاکِستان پہنچے ہیں اور میں اُس وقت سے اس شہر کے ایک چھوٹے سے مکان میں رہ رہا ہوں۔ میں تو یہ سمجھا تھا کہ اس قتل و غارت میں آپ دونوں بھی شہید ہو گئے ہوں گے لیکن آپ کی ہمّت ہے کہ میرے پیارے سے مِٹھو کو لے کر پاکستان پہنچنے میں کام یاب ہو گئی ہو۔ آپ دونوں اس وقت کہاں رہ رہے ہو۔ آؤ گھر چلیں"۔

ثمینہ بولی "پہلے ہمارے ساتھ آؤ۔ ہم جہاں رہتے

ہیں ان کو بتا آئیں۔ مٹھو کی امّی، ابّو اور خود مٹھو دُکان دار کے گھر آئے "تائی جی، مٹھو کے ابّو مل گئے ہیں" ثمینہ نے گھر داخل ہوتے ہی کہا۔

تائی بولی "بیٹا انہیں اندر لے آؤ"۔ مٹھو کسی کو بتائے بغیر مارے خوشی کے دوڑتا ہوا دُکان پر چلا گیا۔

"نانا جی، میرے ابو مل گئے"۔

دُکان دار نے کہا "اچھّا بیٹا، کہاں ہیں تمہارے ابّو"

"نانا جی، گھر پر آؤ آپ کو دکھاؤں"۔

وہ دُکان دار کو گھر لے آیا۔ اب مٹھو کے ابّو نے دُکان دار کا شکریہ ادا کیا کہ اُس نے ان کی بیوی اور بچّے کی اتنی دیر پرورش کی ہے۔ "میں آپ کا احسان ساری زندگی نہیں بھولوں گا۔ آپ ان پر جو خرچ کرتے رہے ہیں مجھ سے لے لیں۔ میں انہیں اپنے گھر لے کر جا رہا ہوں" مٹھو کے ابّو نے کہا۔

"لے جاؤ بیٹا، یہ آپ کی امانت تھے ہمارے پاس اور یہ جو آپ اخراجات کی بات کر رہے ہو تو بیٹا میں کون ہوتا ہوں ان کو کھلانے پلانے والا۔ یہ تو اللہ ہی ہے جو ہم سب کو کھلاتا اور پلاتا ہے۔ وہی سب کا رزاق ہے۔ تم جتنا چاہو اُس کا شکر ادا کرو" بوڑھے دُکان دار نے کہا۔

"بیٹا، آپ کی مرضی، آپ جانا چاہیں تو ہم روک تو نہیں سکتے۔ ہم چوں کہ مٹھو اور ثمینہ سے بہت مانوس ہو چکے ہیں۔ اگر مناسب سمجھیں تو آپ سب ہمارے پاس ہی رہیں۔ ہم اِن کے بغیر زندہ نہیں رہ سکیں گے"۔ تائی اماں یہ کہتے ہوئے رونے لگیں۔ مٹھو کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے اور وہ تائی اماں کہہ کر ان کے ساتھ لپٹ گیا۔ یہ دیکھ کر مٹھو کے ابّا نے کہا "ٹھیک ہے اب ہم یہاں ہی رہیں گے۔ میرا بھی تو اب دنیا میں آپ کے سوا کوئی نہیں رہا۔ تائی امّی آج سے میری امّی، اور تایا جان میرے ابّو"۔

بُوڑھا دُکان دار اور اس کی بیگم ان کے اِس فیصلے پر بہت خوش ہوئے اور اب وہ سب مِل جل کر زندگی گزارنے لگے۔

"دادی اماں کیا یہ سچّی کہانی ہے"۔ بابر، جس نے آج پھر اپنی دادی اماں سے کہانی سُنانے کی فرمائش کی تھی، نے پوچھا۔ "بیٹا" ہاں یہ بالکل سچّی کہانی ہے۔ اب آپ لوگ پاکستان کی پچاس ویں سال گرہ کے موقع پر گولڈن جوبلی کی تقریبات منا رہے ہو ناں۔۔ اس موقع پر مَیں نے مناسب سمجھا کہ آپ کو بتاؤں کہ ہم لوگوں نے آزادی اور اپنا یہ پیارا دیس کتنی مصیبتیں جھیل کر حاصل کیا ہے۔ یہ آپ کے اپنے گھر کی کہانی ہے۔ دُکان دار تایا اور اُن کی بیگم تو چند سال پہلے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اللہ اُن کے درجات بلند فرمائے۔ جب کہ مٹھو کی ماں یعنی تمہاری دادی ثمینہ، میں آپ کے سامنے موجود ہوں۔ اور میرا بیٹا محمّد احمد مٹھو یعنی آپ کے ابّا جان اِس وقت ساتھ والے کمرے میں بیٹھے مطالعہ کر رہے ہیں"۔ بابر کا یہ سننا تھا کہ اس نے "اومائی سویٹ دادی اماں" کہا اور فرطِ جذبات سے دادی اماں کے ساتھ لپٹ گیا۔

عظیم کھلاڑی --- روشن پاکستان

کرکٹ یا ہاکی کے میدان ہوں اتھلیٹکس ٹریک ہوں یا اسکواش کے کورٹ' باکسنگ کے رنگ ہوں یا پہلوانوں کے اکھاڑے' سمندر کی غضب ناک لہریں ہوں یا بلیئرڈ اور سنوکر کی میزیں' ہمارے عظیم کھلاڑیوں نے ہر میدان میں نہ صرف ملک وملت کا نام روشن کیا بلکہ ایسے تاریخ ساز عالمی ریکارڈ قائم کیے جن کو توڑنا تو کجا' برابر کرنا بھی مشکل نظر آتا ہے۔ ہمارے عظیم کھلاڑیوں نے پاکستان میں موجود محدود وسائل کے باوجود ترقی یافتہ قوموں کے مقابلے میں بے پناہ کامیابیاں حاصل کیں۔ سبز ہلالی پرچم کو پوری دنیا میں سب سے اونچا لہرایا۔

پاکستان اتھلیٹس نے شروع ہی سے بہت نمایاں کامیابیاں حاصل کیں اور اپنی کارکردگی سے تمام دنیا کو حیرت میں ڈال دیا۔ ان اتھلیٹس میں پاکستانی فوج کے جمعدار عبدالخالق نے 100 میٹر اور 200 میٹر کی دوڑ میں ایشین گیمز اور کئی دوسرے مقابلوں میں سونے کے تمغے حاصل کیے۔ انہیں ایشیا کا سب سے تیز رفتار کھلاڑی قرار دیا گیا۔ عبدالرزاق نے 110 میٹر کی ہرڈلز میں سونے کا تمغہ جیتا۔ 10000 میٹر لمبی دوڑ اور 5000 میٹر لمبی دوڑ میں مبارک شاہ نے ایشین ریکارڈ قائم کیے۔ ٹوکیو ایشین گیمز 1958ء میں محمد اقبال نے ہیمر تھرو اور محمد نواز نے جیولین تھرو کے مقابلوں میں سونے کے تمغے حاصل کیے۔ اسی طرح پول والٹ (نیزہ پھینکنا) میں پاکستانی فوج کے اللہ دتہ نے بھی بے مثال کارکردگی دکھائی۔

کشتیوں کے مقابلوں میں بھی پاکستان کسی سے پیچھے نہیں۔ کشتیاں چاہے دیسی ہوں یا فری اسٹائل' پاکستانی کھلاڑیوں نے ہر جگہ اپنی فتوحات کے جھنڈے گاڑے ہیں۔ بھولو برادران کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ رستمِ ہند امام بخش کے بیٹوں نے تمام دنیا میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ کسی عالمی پہلوان کی بھی ہمت نہ تھی کہ ان کے مقابلے میں آسکے۔ بھولو برادران میں محمد اسلم' محمد اکرم عرف اکی اور گوگا نے بہت سارے بین الاقوامی مقابلے جیتے۔ محمد اسلم کے بیٹے محمد زبیر عرف جھارا نے بھی بہت سی کامیابیاں حاصل کیں۔ فری اسٹائل کشتی میں مارشل آرٹس کے عالمی ماہر جاپانی پہلوان انوکی کے ساتھ مقابلوں نے ان کو عالمی مقبولیت دی۔ اسی طرح دوسرے بہت سے پاکستانی پہلوانوں نے بھی کشتی کے متعدد عالمی مقابلوں میں شہرت حاصل کی۔ جن میں سراج دین' محمد سعید' محمد اختر' غلام رسول' محمد نیاز اور محمد بشیر خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ محمد بشیر پہلوان نے روم کے اولمپکس مقابلوں میں نقرئی تمغہ جیتا۔

پاکستانی مکا بازوں نے باکسنگ میں بھی کئی بین الاقوامی اعزاز حاصل کیے ہیں۔ مکا بازوں میں وحید میر' ابرار حسین اور حسین شاہ نمایاں ہیں۔ حسین شاہ نے 1988ء کے سیول اولمپکس میں کانسی کا تمغہ اور سارک سیف گیمز میں سونے کے تمغے جیت کر ایک منفرد مقام حاصل کیا۔

سنوکر میں بھی پاکستان کسی سے پیچھے نہیں رہا۔ 1994ء میں ہمارے مایہ ناز کھلاڑی محمد یوسف نے جوہنس برگ' ساؤتھ افریقہ میں منعقد ہونے والے ورلڈ امیچیور کا ٹائٹل جیت کر تمام دنیا کو حیرت میں ڈال دیا۔

اسکواش کا کھیل اور جیت پاکستان کے لیے لازم و ملزوم کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس کے باوجود کہ اس

تحریر و تزئین
سیّد شوکت اعجاز

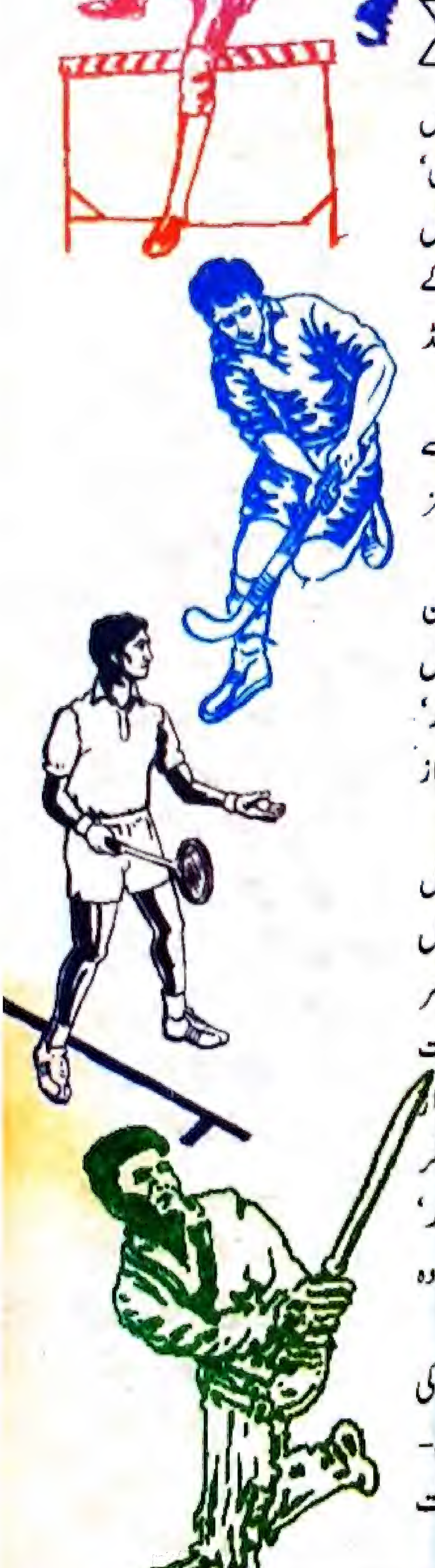

کھیل کے لئے سہولتیں اور کورٹس بہت کم ہیں' پاکستان عالمی نمبر ا کہلاتا ہے۔ آپ دنیا کے کسی بھی حصے میں چلے جائیں اسکواش کا نام آتے ہی فورا" زبان پر پاکستان کا نام آتا ہے۔ پاکستان نے اسکواش میں اعظم خان' ہاشم خان' روشن خان' جہاں گیر خان اور جان شیر خان جیسے نام ور کھلاڑی پیدا کئے ہیں۔ انہوں نے اس کھیل میں ایسے بین الاقوامی ریکارڈ قائم کیے جن کو توڑنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ جن میں جہاں گیر خان کے دس مرتبہ برٹش اوپن اور چھ دفعہ ورلڈ اوپن ٹائٹل کے ریکارڈ بھی شامل ہیں اور اب جان شیر خان نے ورلڈ اوپن 8 دفعہ جیت کر ریکارڈ بہتر کیا ہے۔

سمندری مقابلوں میں متحدہ پاکستان کے ایک بنگالی تیراک بروجن داس نے رودبار انگلستان (فرانس سے انگلستان) تیر کر عبور کی اور بے پناہ مقبولیت حاصل کی۔ اس طرح بہرام آواری نے کشتی رانی میں ایشین گیمز میں نمایاں اعزاز حاصل کیا۔

ہاکی' جو پاکستان کا قومی کھیل ہے قیام پاکستان کے بعد اس پر خصوصی توجہ دی گئی اور ان گنت بین الاقوامی تمغے حاصل کئے۔ جن میں اولمپک گیمز' ایشین گیمز' ورلڈ کپ اور چیمپیئنز ٹرافی شامل ہیں۔ اس کھیل کے ہیرو منیر ڈار' ذکاء الدین' سمیع اللہ' منظور حسین عاطف' غلام رسول' نصیر بندہ' عبدالوحید' حسن سردار' شہباز احمد' اصلاح الدین' حنیف خان' منور الزمان' منظور جونیئر بین الاقوامی شہرت رکھتے ہیں۔ خصوصا" شہباز احمد نے بطور فارورڈ عالم گیر شہرت حاصل کی ہے۔

کرکٹ میں پاکستانیوں نے جو مقام حاصل کیا ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ 1954ء میں اوول ٹسٹ میچ میں برطانیہ کے خلاف پاکستان کی پہلی جیت ایک یادگار کارنامہ ہے جس نے دنیائے کرکٹ میں ہل چل مچادی۔ کسی بھی نئی ٹیم کا بین الاقوامی سطح پر اس مخالف ٹیم کو' جس نے تمام دنیا میں اپنا سکہ جمایا ہو' اس کی سر زمین پر ہرانا واقعی ایک منفرد کارنامہ ہے۔ اس جیت نے عالمی سطح پر پاکستان کا نام روشن کیا۔ مسلسل فتوحات نے آج اس کھیل کو اہل پاکستان کا مقبول ترین کھیل بنا دیا ہے۔ کرکٹ میں پاکستان نے کئی بین الاقوامی اعزاز حاصل کیے ہیں۔ جن میں ورلڈ کپ 1992ء (منعقدہ آسٹریلیا)' ان گنت ٹرافیاں' شارجہ کپ' صحارا کپ' سنگر کپ وغیرہ شامل ہیں۔ اس کھیل کے عالمی شہرت یافتہ پاکستانی کھلاڑیوں میں حنیف محمد' فضل محمود' امتیاز احمد' ماجد خان' عمران خان' جاوید میاں داد' ظہیر عباس' عبدالقادر' وقار یونس' وسیم اکرم کے نام شامل ہیں۔ یہ وہ مایہ ناز کھلاڑی ہیں جنہوں نے عالمی سطح پر ملکی شہرت کو چار چاند لگائے ہیں۔

ہمارے عظیم کھلاڑیوں نے کھیل کے ہر میدان میں پاکستان کا نام روشن کیا ہے۔ آج پاکستان کھیلوں کی بدولت اسلامی ملکوں میں سرفہرست ہے۔ یہ سارے اعزاز ہمیں اپنے عظیم کھلاڑیوں کی بدولت ملے ہیں۔ الحمدللہ مسلمانوں کا ہر میدان میں ماضی تابناک اور حال روشن ہے اور ہم درخشندہ مستقبل کے لیے ہمہ وقت پرعزم اور کوشاں ہیں۔

تحفہ

ف- عزیز

سر صدیق حاضری کا رجسٹر پکڑے کمرے میں داخل ہوئے- لڑکے جو ایک دوسرے کی میزوں پر جمگھٹے لگائے کھڑے تھے' بھاگ کر اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے-

سر صدیق اسکول کے ہر دل عزیز اُستاد تھے- جو کچھ ہی عرصہ پہلے اپنی تعلیم مکمل کر کے آئے تھے- چوں کہ انہیں طالب علمی کے دور سے گزرے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا اس لیے وہ طلبہ کے مسائل اور نفسیات کو اچھی طرح سمجھتے تھے- ان کا رویہ لڑکوں کے ساتھ نہایت دوستانہ تھا-

"ہاں بھئی' اب کچھ باتیں اپنے ملک کی پچاس ویں سال گرہ کے بارے میں ہو جائیں" سر صدیق نے لیکچر ختم کرنے کے بعد عینک اُتار کر رکھتے ہوئے کہا- "آپ لوگوں نے اپنے مُلک کو کیا تحفہ دینے کا سوچا ہے؟"

"تحفہ" لڑکوں کے منہ سے حیرانی سے نکلا-

"کیوں بھئی' اتنی حیرت کی کیا بات ہے- جب کسی کی سال گرہ ہوتی ہے تو اُسے تحفہ تو دیتے ہیں- یہ ہمارے مُلک کی گولڈن جوبلی ہے اور اس کو تحفہ دینے کے بارے میں آپ لوگوں نے کچھ سوچا ہی نہیں" صدیق صاحب نے کہا-

"ملک کو ہم لوگ بھلا کیا تحفہ دے سکتے ہیں؟" آخر سلمان نے سب کے دلوں میں اُٹھنے والے سوال کو زبان دی-

"پاکستان کو تحفہ میں دینے کے لئے ضروری نہیں کہ کوئی مادی چیز ہو- کوئی بھی ایسا کام جس سے ملک کی بھلائی ہو- آپ کے ہم وطنوں کا بھلا ہو" سر نے کہا-

"لیکن سر' اس عمر میں ہم کوئی ایسا بڑا کام کیسے کر سکتے ہیں؟" منعم نے نکتہ اٹھایا-

"میں آپ لوگوں کو ایک تجویز دیتا ہوں- آپ سب جانتے ہیں کہ ہمارے ملک میں محنت مزدوری کی کوئی عزت نہیں- ہمارے ہاں مزدوری کرنے والے کو حقارت سے دیکھا جاتا ہے- کچھ کام ایسے ہیں جن کی اہمیت تو سب تسلیم کرتے ہیں لیکن اُنہیں کرنے والے افراد کو بالکل اہم نہیں سمجھا جاتا- مثلاً اینٹیں ڈھونے والے مزدور' موچی اور سبزی بیچنے والے وغیرہ کو- میری تجویز ہے کہ اِن چھٹیوں میں آپ اس قسم کے عام کام کرنے والے افراد کے ساتھ کچھ وقت گزاریں بلکہ اگر ہو سکے تو ان کاموں کو کرنے کی کوشش کریں- پھر آپ کو اندازہ ہوگا کہ یہ کام کتنے اہم ہیں اور اِنہیں کرنا کتنا مُشکل ہے- اِس طرح آپ کے دل میں محنت مزدوری کرنے والوں کی عزت پیدا ہوگی اور اگر آپ لوگ اپنی سوچ میں یہ مثبت تبدیلی پیدا کر لیں تو یہی آپ کا تحفہ ہوگا- کیا خیال ہے؟" آخر میں سر نے لڑکوں سے پوچھا-

"سر ہم ضرور ایسا کریں گے" سب سے اونچی آواز سلمان منعم اور احسن کے گروپ کی تھی- یہ اسکول کے ذہین ترین لڑکے تھے-

"آپ لوگوں نے اپنے ان تجربات اور احساسات کو مضمون کی صورت میں لکھ کر لانا ہے- جس پر بعد میں انعامات بھی ملیں گے" سر نے کہا-

یہ سن کر لڑکوں کے جوش و خروش میں اور اضافہ ہوا-

"یار اشھد' سر کو بھی عجیب باتیں سوجھتی ہیں- اب ہم مزدوروں اور موچیوں والے کام کریں گے" عزیز نے ناک چڑھاتے ہوئے کہا-

"ہاں یار' ہم ایسے لوگوں کے ساتھ کیوں خوار ہوں" اشھد نے کہا-

"تم جیسے کام چوروں سے اور اُمید بھی کیا ہوگی۔ تم تو اسکول کا کام بھی اپنی امّی سے کراتے ہو۔ ہم لوگ تو یہ اسائن منٹ ضرور پوری کریں گے" سلمان نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں ضرور' میں تو ابھی سے سوچ رہا ہوں کہ کتنا مزا آئے گا" منعم نے جوش سے کہا۔

"واقعی جوتے گانٹھنے میں تو بڑا مزا آتا ہے۔ اسی لیے تمہارے موچی کی باچھیں ہر وقت کھلی رہتی ہیں" اشہد نے طنزاً کہا۔

"تم تو جوتے نہیں گانٹھتے پھر بھی تمہاری صورت ہر وقت رونی بنی رہتی ہے" منعم نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"چھوڑو یار' تم بھی کیسے کیسے جاہلوں کے منہ لگتے ہو۔ ایسی جاہلانہ سوچ نے ہمارے مُلک کو ترقی نہیں کرنے دی۔ آؤ ہم گھر چلیں" احسن نے اس کا بازو کھینچتے ہوئے کہا۔

"پھر کیا سوچا ہے تم نے؟ کون سا کام ٹھیک رہے گا؟" سلمان نے دونوں سے پوچھا۔

آج پہلی چھٹی تھی اور وہ تینوں سلمان کے کمرے میں بیٹھے پروگرام بنا رہے تھے۔ "کام تو سب ہی اچھے ہیں لیکن انہیں کرنے کے لیے محنت کے ساتھ ساتھ مہارت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمارے لیے تو اینٹیں ڈھونے کا کام ٹھیک رہے گا۔ ویسے بھی اسکول بیگ اُٹھا اُٹھا کر ہمیں بوجھ اٹھانے کا اچھّا خاصا تجربہ ہو چکا ہے" منعم نے مشورہ دیا۔

"ویسے تمہاری تو شکل بھی ایک بوجھ اُٹھانے والے جانور سے ملتی ہے" سلمان نے چڑانے کے لیے کہا۔

"چلو میری تو صرف شکل ملتی ہے تمہاری طرح عقل تو نہیں ملتی" منعم نے منہ توڑ جواب دیا۔

"فضول باتیں چھوڑو' کام کی بات کرو۔ میرے خیال میں مزدوری والا مشورہ صحیح ہے۔ سڑک پر جو بڑی سی عمارت بن رہی ہے' وہاں میں نے کئی بار اپنی عمر کے لڑکوں کو کام کرتے دیکھا ہے" احسن نے کہا۔

"لیکن وہاں کام کرنے کے لیے ہمیں اپنے حُلیے بدلنا پڑیں گے" سلمان نے رائے دی۔

"ہاں یہ ضروری ہے۔ ورنہ تم دونوں کی تو خیر ہے البتہ میرے جیسے حسین جوان کا مزدور لگنا کافی مشکل ہے" احسن نے اپنے گورے چٹّے منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"ہاں مزدور لگنا تو تمہارا واقعی مشکل ہے البتہ چپڑاسی تو شکل سے لگتے ہو" سلمان نے جل کر جواب دیا۔

"اُفوہ' بار بار پٹڑی مت بدلو۔ ابھی تو گھروں میں بھی بات کرنی ہے۔ دوسری اہم بات یہ کہ پتا نہیں ہمیں وہاں مزدوری ملتی بھی ہے یا نہیں" منعم نے آگے کی سوچتے ہوئے کہا۔

"یار' تم مزدور کم اور فقیر زیادہ لگ رہے ہو" احسن نے منعم کا حلیہ دیکھ کر ہنسی روکتے ہوئے کہا۔ اس نے اپنے چھوٹے بھائی کا پرانا جوڑا پہن رکھا تھا۔ جس کا رنگ اڑ چکا تھا۔ قمیص گھٹنوں سے کافی اونچی تھی اور شلوار ٹخنوں سے۔ بالوں میں تیل ملنے کے بعد انہیں سلجھانے کے بجائے چاروں سمتوں میں بکھیر رکھا تھا اور منہ پر جگہ جگہ دھبّے لگے ہوئے تھے۔ سر میں گرد پڑی ہوئی تھی جو تیل کی چکنائی سے مل کر کیچڑ بن رہی تھی۔

"یار' ہم مزدوری کرنے جا رہے ہیں کوئی گٹر صاف کرنے نہیں۔ ایسا لگ رہا ہے تم کوئی علاقہ صاف کر کے آئے ہو" احسن نے اس کے حلئے کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

"اور ذرا اپنا حلیہ بھی تو ملاحظہ فرمائیے۔ آپ تو یوں تیار ہوئے ہیں جیسے کسی پنجابی فلم کا ہیرو گانا گانے لگا ہو۔ یہ ٹخنوں تک لمبی رنگین قمیص اور یہ کُھلے پائینچوں والی شلوار اور یہ گھنگریالے بال" سلمان نے باتھ روم سے نکلتے ہوئے کہا۔ اسے دیکھ کر بے اختیار دونوں کی ہنسی نکل گئی۔ اس نے آنکھوں میں بھر بھر کے سرمہ لگایا ہوا تھا۔ درمیان میں مانگ نکال کر بال دونوں طرف بٹھائے ہوئے تھے اور نقلی مونچھیں لگائی ہوئی تھیں۔ جو دونوں طرف سے اُٹھی ہوئی تھیں۔ "او پاگل' یہ مونچھیں تو اتار دو۔ صاف نقلی لگ رہی ہیں۔ ویسے بھی وہاں تم نے ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر بیٹھے نہیں رہنا بلکہ مشقت کرنی ہے" منعم نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

وہ تینوں ایک زیرِ تعمیر عمارت کے سامنے کھڑے تھے۔ یہ کوئی پلازہ بن رہا تھا۔ جس کی تین منزلیں تھیں۔ بہت سے مزدور وہاں کام کر رہے تھے۔ چار دیواری تاروں سے بنائی گئی

تھی اور ایک عارضی سا گیٹ بھی بنا ہوا تھا۔ اندر عمارتیں بنانے والا کئی طرح کا سامان پڑا تھا۔ عمارت کافی حد تک بن چکی تھی۔ تینوں ڈرتے ڈرتے گیٹ سے اندر داخل ہوئے۔ سامنے چارپائی پر ایک آدمی نیم دراز حقّہ پی رہا تھا۔ اس کی نظریں سامنے کام کرتے مزدوروں پر تھیں۔ تینوں اس کی چارپائی کے قریب جا کر کھڑے ہو گئے۔

"السلامُ علیکم" سلمان نے ہمّت کر کے پہل کی۔ آدمی نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ "کیا بات ہے؟" اس نے کڑے لہجے میں پوچھا۔

"جی ہم ٹھیکے دار صاحب سے ملنا چاہتے ہیں" سلمان نے کہا۔

"ہاں میں ہی ٹھیکے دار ہوں، کیا کام ہے؟" اس نے اپنی کھُردری آواز میں کہا۔

"وہ جی ہم مزدوری کے لیے آئے ہیں" سلمان نے کہا۔

"آدھا دن تو گزر گیا۔ کل آنا، کل دیکھیں گے" اس نے انہیں ٹالتے ہوئے کہا۔

"جی ہمیں کام کی بڑی ضرورت ہے۔ اگر آج ہی کام مل جائے تو آپ کو دعائیں دیں گے جی۔ بے شک ہمیں آدھی دہاڑی [illegible]" سلمان نے [illegible] بھرے لہجے میں کہا جب کہ

منعم اور احسن مظلوم صورت بنائے خاموش کھڑے تھے۔

"اور تمہارا کیا خیال ہے کہ آدھے دن کی تمہیں پوری دہاڑی ملے گی" ٹھیکے دار نے طنزاً کہا "وزن اٹھا لو گے؟"

"ہاں جی اٹھا لیں گے" سلمان نے کہا اور ان دونوں نے سرہلا کر تائید کی۔

"اچھا ٹھیک ہے ادھر منشی کو اپنا نام پتا لکھوا دو اور کام پوچھ لو"۔

تینوں منشی کے پاس گئے جو شکل سے نہایت عیار نظر آ رہا تھا۔ وہاں انہوں نے اپنے فرضی نام اور پتا درج کرایا۔ اس نے انہیں جیدے نامی آدمی کے پاس بھیجا۔ جس نے انہیں سامان اٹھانے پر لگا دیا۔ وزن اٹھا اٹھا کر شام تک ان کے جسم تھکن سے چور ہو گئے۔ درمیان میں صرف ایک مرتبہ چائے کا وقفہ ہوا۔ حال آں کہ انہوں نے دوپہر کے کھانے کے بعد کام شروع کیا تھا پھر بھی تھکن اور بھوک سے ان کی حالت بری ہو گئی تھی۔ انہوں نے دوسرے کام کرتے مزدوروں کو تجسّس بھری نگاہوں سے دیکھا جو صبح سے کام کر رہے تھے۔ یقیناً وہ ہر روز اتنی ہی مشقت کرتے تھے۔ آخر خدا خدا کر کے کام ختم ہونے کا اعلان ہوا۔ سب مزدور اپنا سامان ایک کوٹھری نما کمرے میں رکھنے لگے جو شاید چوکی دار کے لیے بنایا گیا تھا۔ پھر

باری باری سب لوگ منشی سے اپنی اپنی مزدوری کی رقم لینے لگے۔ جب ان تینوں کو مزدوری کے پیسے ملے تو انھیں اپنی پہلی کمائی کی بہت زیادہ خوشی ہوئی۔ وہ تینوں نل پر اپنے ہاتھ اور پاؤں دھونے لگے جو مٹی سے لتھڑے ہوئے تھے۔

مزدور رفتہ رفتہ جا رہے تھے۔ ایک آدمی ٹھیکے دار سے ملنے آیا۔ اس کے جانے کے بعد ٹھیکے دار نے جیدے کو آواز دی۔ جیدا جو حُقّے کے کش لگا رہا تھا، ہڑبڑا گیا اور حُقّہ چھوڑ کر بھاگا۔ تینوں نے اُسے بھاگتے ہوئے دیکھا اور مسکرانے لگے۔ تینوں ابھی تک اپنے جسم سے کیچڑ چھڑانے میں مصروف تھے۔

"یار، یہ مسٹر جیدے اور ٹھیکے دار میں کیا کانفرنس ہو رہی ہے؟" دونوں بار بار ہماری طرف دیکھ رہے ہیں۔ کہیں ہمارا پول تو نہیں کھل گیا" احسن نے دونوں کو دیکھتے ہوئے کہا جو بڑے اطمینان سے پاؤں رگڑنے میں مصروف تھے۔

"ارے، یہ جیدا تو ہماری طرف آ رہا ہے" منعم نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

"ہاں بھئی جوانو، کدھر کی تیاری ہے؟" جیدے نے بڑے دوستانہ انداز میں مسکراتے ہوئے پوچھا تو تینوں بڑے حیران ہوئے۔ کیوں کہ کام کے دوران میں اس کا رویہ ان تینوں کے ساتھ خاصا خشک اور سخت تھا۔ اس اچانک بدلاؤ پر حیرت لازمی تھی۔

"بس جی اب جا کر رات گزارنے کا کوئی ٹھکانا ڈھونڈیں گے۔ ہمارا کون سا کوئی عزیز رشتے دار شہر میں رہتا ہے" سلمان نے احمقانہ انداز میں دانت نکالتے ہوئے کہا۔

"ایسا کرو، تم تینوں یہیں سو جاؤ۔ چوکی دار کے پاس مزدوروں کے فالتو بستر پڑے ہیں۔ آج جمعرات ہے اس لیے صبح ان کی چھٹی ہے۔ اس لیے آج سارے چلے گئے ہیں" جیدے نے کہا تو تینوں گڑبڑا گئے۔ تینوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے استفسار کیا کہ کیا کریں پھر "اچھا جی آپ کی بڑی مہربانی ہم ابھی کھانا کھا کر آتے ہیں" سلمان نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

جیدا مطمئن ہو کر ٹھیکے دار کی طرف گیا جو شاید انتظار میں کھڑا تھا۔ "یار، یہ کیا حماقت ہے؟ تم نے یہاں رکنے کی حامی کیوں بھری؟ گھر والوں سے جوتے کھانے ہیں کیا؟ ویسے بھی تھکن سے بُری حالت ہے۔ گھر جا کر آرام سے سوئیں گے" منعم نے جیدے کے جاتے ہی سلمان کے لتے لیے۔

"اتنے نازک مزاج بھی نہ بنو۔ ایک دن آرام نہیں کرو گے تو فوت نہیں ہو جاؤ گے۔ ابھی ہم سیدھے گھر ہی جائیں گے۔ وہاں کھانا کھا کر انھیں بتا کر پھر آ جائیں گے۔ پتا نہیں مجھے یہ ٹھیکے دار اور جیدا کچھ مشکوک لگ رہے ہیں۔ آخر اس نے ہمیں یہاں رکنے پر کیوں مجبور کیا ہے؟" سلمان نے خیال آرائی کی۔

"شاید بے چارے نے ہمیں ہمدردی میں ہی کہا ہو۔ تم خواہ مخواہ اس کی نیت پر شک کر رہے ہو" منعم نے جیدے کی حمایت کرتے ہوئے کہا۔

"ویسے یہ اتنا بے چارہ بھی نہیں۔ ٹھیکے دار کا خاص چمچہ لگتا ہے۔ دوسرے مزدوروں کے ساتھ اس کا رویہ خاصا ظالمانہ تھا اور ہمارے ساتھ بھی اس نے کچھ اچھا برتاؤ نہیں کیا۔ اس وقت یقیناً اس کا اپنا کوئی مقصد ہو گا ورنہ بلا سبب یہ اتنا مہربان نہیں ہو سکتا" احسن نے تجزیہ کرتے ہوئے کہا۔

"چلو ٹھیک ہے۔ ایک رات کی نیند قربان کر لیتے ہیں۔ دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے" منعم نے کہا۔

تینوں کھلے آسمان تلے چارپائیوں پر لیٹے ہوئے تھے۔ نیند ان کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ چوکی دار عمارت کا چکر لگانے باہر گیا ہوا تھا اور جیدا چوکی دار کی کوٹھری میں لیٹا ہوا تھا۔ اچانک سڑک سے ٹرک کی آواز آئی۔ پھر ٹرک گیٹ کے قریب رُکا۔ ڈرائیور چھلانگ لگا کر نکلا اور چوکی دار کی کوٹھری میں گھُس گیا۔ منعم چارپائی سے اُترنے لگا تو احسن نے اس کا بازو کھینچا۔ "چپ چاپ پڑے رہو۔ اُٹھنا نہیں" اس نے سرگوشی کی۔ تینوں دم سادھے پڑے رہے۔

"ہاں بھئی، کیا پروگرام ہے؟ سامان اتارو ہم نے آگے بھی جانا ہے" رات کی خاموشی میں ٹرک ڈرائیور کی آواز آئی۔

"آج اچانک کیسے پروگرام بن گیا؟ پرسوں تو تم نے کہا تھا کہ اگلا پھیرا ہفتے بعد لگاؤں گا۔ میں نے تو سارے بندوں کو چھٹی دے دی تھی۔ پھر ٹھیکے دار نے بتایا کہ آج پھر کچھ مال آنا

ہے تو تین نئے لڑکے آئے تھے، مجبوراً انہیں روکنا پڑا" جیدے نے کہا۔

"نئے لڑکے کچھ گڑبڑ نہ کر دیں" ڈرائیور نے کہا۔ "او نہیں۔ بڑے ہی بے وقوف سے لڑکے ہیں۔ شاید گھر سے بھاگ کر آئے ہیں۔ یہاں ان کا کوئی نہیں۔ ٹھیکے دار صاحب کہ رہے تھے کہ اگر لڑکے صحیح نکلے تو انہیں مستقل کام پر لگا لیں گے۔ ایسے بے وقوف بڑے کام کے ہوتے ہیں" جیدے کی آواز انہیں صاف سنائی دے رہی تھی۔ تینوں چوکنے ہو گئے۔

تھوڑی دیر بعد جیدے نے انہیں آکر جھنجھوڑا "اٹھو اوئے"۔

"کیا ہوا جی؟" سلمان نے ہڑبڑا کر گہری نیند سے اٹھنے کی اداکاری کی۔

"خیر ہے، بس ذرا سامان ٹرک سے اُتارنا ہے۔ ان دونوں کو بھی اٹھاؤ" اس نے حکم دینے کے انداز میں کہا اور ٹرک کی طرف مڑ گیا۔ تینوں سامان اُٹھا اُٹھا کر اندر رکھنے لگے۔ چوکی دار، جیدا اور ٹرک ڈرائیور بھی ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ یہ تینوں ایک نامکمل کمرے میں بوریاں رکھتے جا رہے تھے۔ بوریاں رکھوا کر انھوں نے انہیں رُکنے نہیں دیا بلکہ انہیں وہاں سے بھگا دیا۔ وہ تینوں آکر لیٹ گئے۔ بعد میں ٹرک کے جانے کی آواز آئی۔ جب جیدے کے ساتھ چوکی دار بھی کوٹھری میں چلا گیا تو انہوں نے کچھ دیر انتظار کیا۔ جب ہر طرف خاموشی چھا گئی تو وہ آہستہ سے اپنی چارپائیوں سے اُٹھے اور اس جگہ پہنچے جہاں انہوں نے بوریاں رکھی تھیں۔ وہاں سے سارا سامان غائب تھا۔ انہوں نے دوسرے کمروں میں تلاش شروع کی۔ آخر چوتھے کمرے میں انہیں فرش پر لکڑی کا ایک چوکور ٹکڑا نظر آیا۔ انہوں نے اسے اُٹھایا تو نیچے سیڑھیاں نظر آئیں۔ روشنی کافی کم تھی۔ منعم نے اپنی جیب سے پنسل ٹارچ نکالی جو وہ ہر وقت جیب میں رکھتا تھا۔ تینوں ٹارچ کی مدھم روشنی میں سیڑھیاں اترنے لگے۔ تینوں کے دل دھک دھک کر رہے تھے کہ کہیں نیچے کوئی اور آدمی نہ ہو۔ ان خدشات کے دوران میں ان کے پاؤں فرش پر ٹکے۔ ٹارچ کی مدھم روشنی میں کچھ صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ انہوں نے ہاتھ سے دیوار کو ٹٹولا۔ آخر منعم کے ہاتھ سوئچ بورڈ سے ٹکرائے۔ اس نے بٹن دبایا۔ یک لخت کمرا روشن ہو گیا۔ یہ کافی بڑا کمرا تھا۔ مختلف قطاروں میں مختلف قسم کی چیزیں پڑی تھیں۔ ایک طرف لکڑی کی پٹیاں تھیں تو دوسری طرف چھوٹے چھوٹے ڈرم تھے۔ ایک طرف دو بوریاں پڑی تھیں جو انہوں نے ٹرک سے اتاری تھیں۔

"یار، معاملہ تو کافی گڑبڑ لگتا ہے۔ چلو ذرا پہلے ان بوریوں میں دیکھیں کیا ہے" سلمان نے کہا۔

"لیکن ان ساری بوریوں کو کھولنے میں تو کافی وقت لگے گا۔ اگر اتنے میں کوئی جاگ گیا تو" منعم نے خدشے کا اظہار کیا۔

"فکر نہ کرو، ہمیں زیادہ تردّد نہیں کرنا پڑے گا۔ جن بوریوں میں گڑبڑ کا خطرہ تھا ان کے منہ پر میں نے اپنی جیب میں پڑے اے بی سی والے اسٹکر لگا دیئے تھے۔ ابھی اسٹکر والی بوریاں ڈھونڈ لیتے ہیں" احسن نے حل بتایا۔

بوریاں چوں کہ ترتیب سے پڑی تھیں اور سب کے منہ سامنے کی طرف تھے اس لیے جلد ہی انہیں وہ اسٹکر نظر آ گئے۔ انہوں نے جب اسٹکر والی آخری بوری کو نکالا اور پھل

کاٹنے والے چاقو سے جو سلمان کے پاس تھا، اس کو پھاڑا تو سیمنٹ کے درمیان انہیں ایک گیند نما چیز نظر آئی۔ انہوں نے اسے نکال لیا۔ "یہ کیا چیز ہے؟" سلمان نے اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا "وزن تو زیادہ نہیں۔ دیکھنے میں تو گیند لگتا ہے۔ اس میں سے تو عجیب سی بو بھی آ رہی ہے"۔

"پاگل، یہ بم ہے" احسن نے کہا تو منعم کا ہاتھ کانپا۔ "اب میں اسے کہاں رکھوں؟ کہیں پھٹ ہی نہ جائے" منعم نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ایسے ہی تھوڑی پھٹ جائے۔ ادھر لاؤ میں احتیاط سے رکھ دوں" احسن نے بم پکڑ کر آہستہ سے سیمنٹ کی بوری پر رکھ دیا۔

"جلدی چلو پولیس کو اطلاع کریں۔ یقیناً ان بوریوں میں اور بھی اسلحہ بارود ہوگا کہیں کوئی آ ہی نہ جائے۔ شکر ہے ان لوگوں نے ہمیں بے وقوف سمجھتے ہوئے ہم پر دھیان نہیں دیا۔ ورنہ پتا نہیں ہمارا کیا بنتا" تینوں دبے پاؤں باہر نکلے اور لکڑی رکھ کر راستہ دوبارہ بند کر دیا۔

"ہم دونوں یہاں رکتے ہیں۔ کہیں ہماری خالی چارپائی پر کسی کی نظر نہ پڑ جائے۔ تم پچھلی طرف سے دیوار پھاند کر جاؤ اور پولیس کو اطلاع کر دو" احسن نے سلمان سے کہا۔

"آپ کی قسمت اچھی تھی۔ بلکہ یوں کہیے کہ آپ کی اداکاری بہت اچھی تھی کہ ان لوگوں کو آپ پر ذرا سا بھی شک نہیں ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو نیک نیتی کا پھل دیا ہے۔ ایسی گھناؤنی سازش آپ جیسے نونہار بچّوں کے ہاتھوں فاش ہوئی کہ جس کی ہوا بڑوں کو بھی نہیں لگی تھی۔ یہ لوگ دشمن ملک کے آلہ کار ہیں۔ ان لوگوں نے اب یہ نیا طریقہ اپنایا تھا کہ غیر تعمیر شدہ عمارتوں کو اپنے مذموم عزائم کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ ایسی جگہوں پر بندے خرید کر انہیں اپنے ساتھ ملاتے اور وہاں اپنا سامان رکھتے تھے کسی کو شک نہیں ہوتا تھا۔ کیوں کہ لوگ یہ سمجھتے کہ عمارت بن رہی ہے اس کا سامان ہوگا۔ ہم نے جیدے سے اپنی تفتیش کا آغاز کیا تھا۔ جوں جوں ہم تفتیش میں آگے بڑھتے گئے، نئے نئے انکشاف ہوتے گئے۔ اصل میں یہ دشمن ملک کی باقاعدہ اسکیم تھی۔ جس کے تحت وہ بڑی پلاننگ سے مختلف جگہوں پر اسلحہ بارود جمع کر رہے تھے۔ ان لوگوں کا پروگرام ہمارے ملک میں گولڈن جوبلی تقریبات کے دوران میں تخریب کاری کرنے کا تھا۔ دیکھیے اللہ کی قدرت کہ جب وہ بچانا چاہتا ہے تو کیسے کیسے وسیلے بناتا ہے۔ اگر آپ لوگ وہاں نہ جاتے تو شاید ہم ان لوگوں تک نہ پہنچ پاتے" پولیس آفیسر نے انہیں تحسین آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ کے اُستاد بھی قابلِ تعریف ہیں۔ جنہوں نے آپ و ایسی راہ بتائی" دوسرے پولیس افسر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ان سے بھی ملنا پڑے گا۔ انہوں نے آپ لوگوں کی صورت میں ملک کو تحفہ دیا ہے" پہلے نے کہا۔

"لیکن ہمارا تحفہ تو کچھ اور ہے" ان تینوں نے دل میں سوچا۔ اگلے دن تینوں اسکول جا رہے تھے۔ سڑک بن رہی تھی۔ مزدور کام کر رہے تھے۔ تینوں نے رک کر کام کرنے والے مزدوروں کو باجماعت سلام کیا۔ انہوں نے حیرت سے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ اور ان کے لبوں پر کھیلتی دوستانہ مسکراہٹ نے مزدوروں کے چہروں پر بھی مسکراہٹ بکھیر دی۔ یہی مسکراہٹ ان کی طرف سے اپنے ملک کے لیے تحفہ تھی۔

مجھے پاکستان جانا ہے

Sharjeel Ahmed

عبیدہ ملک

تمام بچّے رات ہوتے ہی خالہ بی کے گرد جمع ہو گئے اور کہانی سُنانے کی فرمائش کرنے لگے۔

"بھئی کہاں سے لاؤں میں ہر روز ایک کہانی" خالہ بی نے جھنجھلا کر کہا۔

"آپ نے تو خالو میاں کے ساتھ بحری جہاز میں دُنیا گھومی ہے۔ کہانی نہیں تو کوئی واقعہ ہی سُنا دیجئے"۔

خالہ بی نے کافی سوچنے کے بعد کہا "اچھا آج میں آپ کو ایک سچّا واقعہ سُناتی ہوں۔ تو سنو۔

"ہمارا جہاز جب بھی پانی کا لمبا سفر کرنے کے بعد خشکی کی طرف بڑھنے لگتا تو کسی نئے ملک کی روشن بندرگاہ نظر آنے لگتی۔ جہاز کا ہر مسافر خوشی کے مارے جہاز کے تختے پر آ کھڑا ہوتا۔ وہی خشکی، وہی شہر، وہی عمارتیں اور بازار جو کچھ اہمیت نہیں رکھتے تھے کئی دن جہاز میں گزارنے کے بعد اُن کی قدر و قیمت کا پتا چلتا۔ جہاز جن دنوں پانی میں چل رہا ہوتا تو یوں لگتا گویا کائنات پانی کے سوا کچھ نہیں۔ البتہ کبھی کبھار سمندری بگلوں کی آوازیں اور ڈولفن مچھلی کی آزادانہ چھلانگیں مسافروں کے لئے دل کشی کا سامان پیدا کرتیں۔

"یہ واقعہ ہالینڈ کی بندرگاہ ایمسٹرڈیم کا ہے۔ ہالینڈ کا سرکاری نام نیدرلینڈز ہے، یہ یورپ کا ایک ملک ہے"۔

"شکر ہے خالہ بی کی تمہید تو ختم ہوئی" حسب عادت نازلی نے فقرہ کسا۔

"اچھا جاؤ، ہم نہیں سناتے۔ جب سچّا واقعہ سنائیں گے تو جو بات یاد آئے گی وہی بولیں گے" خالہ بی نے

ناراض ہوتے ہوئے کہا۔

سب بچّے نازلی پر چیخے۔ پھر خالہ بی سے کہا "پلیز خالہ' نازلی کی تو عادت ہی ہے کچھ نہ کچھ بولنے کی۔ نازلی' خالہ کو سوری کہ دو"۔

نازلی نے کہانی سننے کی بے تابی میں فوراً" سوری کہ دیا اور خالہ کہانی سنانے لگیں۔

"ہاں تو بچو' جب جہاز ایم سٹرڈیم پُہنچا تو تمہارے خالو نے کہا کہ میں جلدی جلدی کام نپٹا لوں' شام کو گھومنے نکلیں گے اور کھانا بھی باہر ہی کھائیں گے۔

"کِسی بندرگاہ پر پُہنچنے کے بعد پہلی خوشی گھر سے آئے ہوئے خطوط کی ہوتی تھی جو جہاز رُکتے ہی ایجنٹ لے کر پُہنچ جاتا تھا۔ سب کی یہی دعا ہوتی کہ یا اللہ بُہت سے خط آئے ہوں۔ خیر بھئی نازلی کہیں پھر ناراض نہ ہو جائے لٰہذا میں اصل واقعہ کی طرف آتی ہوں۔

"شام کو تیار ہو کر ہم جہاز سے باہر نکلے۔ جہاز کے عملے کے علاوہ بندرگاہ کے باہر سب مقامی گورے یعنی ہالینڈ کے باشندے نظر آ رہے تھے۔ ابھی ہم سوچ ہی رہے تھے کہ کس طرف جائیں اور ٹیکسی لی جائے یا پیدل ہی گھوما جائے کہ ایک آدمی جو پاکستانی دکھائی دیتا تھا' ہمارے قریب آیا۔ وہ دھیمے لہجے میں بولا "معاف کیجئے گا' کیا آپ کِسی پاکستانی جہاز میں آئے ہیں"۔

ہم نے کہا "پاکستانی جہاز میں تو نہیں آئے مگر ہیں پاکستانی"۔

"پھر اُس نے بتایا کہ وہ پاکستانی ہے۔ فیصل آباد کا رہنے والا ہے اور دو تین سال سے ایم سٹرڈیم میں مقیم ہے۔ پھر بولا "یہاں پر میں بہت اُداس ہوں۔ اِس لیے میں اکثر یہاں اپنے ہم وطنوں کی تلاش میں آتا رہتا ہوں"۔

پھر چند لمحوں بعد یوں لگا جیسے ہم ایک دوسرے کو بہت عرصے سے جانتے ہیں۔ وہ اصرار کرنے لگا کہ اگر ہمارا کوئی خاص پروگرام نہیں تو اس کے گھر چل کر کھانا کھائیں۔ لگ تو بہت عجیب رہا تھا مگر اس کے اصرار میں اِس قدر خلوص تھا کہ انکار کی ہمّت نہیں ہو رہی تھی۔

اُس کے گھر پہنچے تو یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ اُس کی بیوی ولندیزی ہے مگر شلوار قمیص پہنے' اپنے بچّے کو پیڑھے پر بٹھائے اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلا رہی ہے۔

ہم نے داخل ہوتے ہی کہا "ہیلو"۔

وہ بولی "السّلامُ علیکم"۔

ہم کافی شرمندہ ہوئے۔ ہمارے میزبان' جِن کا نام رفیق تھا' نے اسے ولندیزی زبان میں ہمارے متعلق بتایا۔ اِس پر اس نے ٹوٹی پھوٹی اُردو میں کہا "بِسم اللہ' مجھے آپ کے آنا کی بُہت خوشی ہے' مہمان اللہ کی رحمت ہوتا۔ آپ کھانا ہمارے ساتھ کھائیں ابھی کھانا تیار ہو جاتا"۔

اس کے بعد اس نے بچّے کو کھانا کِھلانے کے بعد گود میں سلایا اور پھر بستر پر لٹانے کے بعد کہا "فی امان

اللہ" اور پھر کام میں مصروف ہو گئی۔

"میں اور تمہارے خالو تو اس قدر حیران ہوئے کہ ایسے لگا جیسے ہم بولنا ہی بھول گئے ہوں۔ رفیق صاحب ہماری حالت سے خوب لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے بتایا کہ ان کی بیوی جس کا اب مسلم نام صفیہ ہے ایک یہودی جوڑے کی اکلوتی بیٹی ہے۔ وہ اپنے مذہب سے مطمئن نہ تھی چناں چہ اس نے مختلف مذہبوں کا مطالعہ کیا۔ ان میں سے دینِ اسلام اِس کو سچّا مذہب لگا"۔

"صفیہ کچھ دیر بعد کھانا لے آئی۔ رفیق صاحب بولے "اب بقیہ حصّہ آپ صفیہ کی زبانی سنئے۔ جہاں میری ضرورت ہوئی میں سنا دوں گا"۔

"مرغی کا قورمہ، مٹر پلاؤ اور آلو کی بھجیا، ہر چیز بے حد لذیذ اور نہایت سلیقے سے پیش کی گئی۔ مجھے تو تجسّس کے مارے کھانا نہیں سوجھ رہا تھا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ سب کچھ چھوڑ کر صفیہ کی باقی کہانی سنوں۔ خیر ہماری اس قدر دِل چسپی دیکھ کر صفیہ نے بتانا شروع کیا "مجھے پتا چلا کہ لندن میں اِسلامی مرکز ہے۔ اس مرکز سے اسلام کے متعلق معلومات مل جاتی ہیں۔ میں نے دل میں ٹھان لیا کہ میں لندن جاؤں گی۔ میرے والدین تو بہت امیر ہیں۔ مگر میری اپنی جمع شدہ رقم بہت کم تھی اور میں جانتی تھی کہ میرے ماں باپ میرے خیالات سنیں گے تو وہ مجھے ماریں پیٹیں گے۔ وہ مُسلمانوں کو بالکُل اچھّا نہیں سمجھتے تھے مگر میرا اسلام قبول کرنے کا ارادہ جنون کی حد تک پہنچ گیا تھا۔ چناں چہ میں اپنا ذاتی جیب خرچ لے کر کسی سوچی سمجھی اسکیم کے بغیر خاموشی سے لندن روانہ ہو گئی۔ میں سیدھی اسلامی مرکز پہنچی۔ میری دل چسپی دیکھ کر اسلامی مرکز میں موجود لوگوں نے میری مدد کی اور پھر مجھے باقاعدہ کلمہ پڑھا کر مسلمان کیا گیا۔ اس عرصے میں مجھے ایک انگریز بڑھیا کے ہاں رہنے کے لیے کرائے پر جگہ مل گئی۔

"میں نے پڑھا تھا کہ پاکستان ایک ایسا ملک ہے جس میں بڑے اچھے طریقے سے اسلام کی پیروی کی جاتی ہے۔ چناں چہ اب مجھ پر یہی دھن سوار تھی کہ میں کسی نہ کسی طرح پاکستان پہنچ جاؤں۔ مجھے ایک نو مسلم انگریز لڑکی نے بتایا کہ پاکستان جانے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ کسی پاکستانی سے شادی کر لو"۔ یہ کہ کر صفیہ خوب ہنسی اور کہنے لگی "رفیق، اب آپ بتائیں کہ ہماری شادی کیسے ہوئی؟"

"رفیق صاحب نے کافی ہنسنے کے بعد بتایا کہ صفیہ لندن میں جس گھر میں آ کر ٹھہری، میں بھی اسی بڑھیا کا کرائے دار تھا۔ میں قانون پڑھنے لندن گیا تھا مگر کچھ مالی مسائل کی وجہ سے ان دنوں بطور بس کنڈکٹر کام کر رہا تھا۔ صفیہ کی انگریز بڑھیا سے کافی دوستی ہو گئی تھی۔ کیوں کہ صفیہ اس کا بہت سا کام کر دیا کرتی تھی۔ بڑھیا نے جب صفیہ کی کہانی سنی اور پھر پاکستان جانے کی خواہش کے متعلق سنا تو اس نے اسے بتایا کہ میرا دوسرا کرائے دار پاکستانی ہے۔ صفیہ نے اسلامی مرکز سے پھر رابطہ کیا اور ان لوگوں سے کہا کہ میں رفیق (یعنی مجھ سے) شادی کرنا چاہتی ہوں۔ اسلامی مرکز والوں نے مجھ سے رابطہ کیا اور مجھے شادی کے لیے قائل کرنے کی کوشش کی۔ وہ مجھے کہنے لگے "دیکھو اگر آپ کو اپنے مذہب سے پیار ہے تو تم اس نو مسلم لڑکی سے شادی کر لو۔ وہ اپنے ماں باپ، اپنا ملک اور اپنا مذہب چھوڑ کر تمہارے مذہب کی خاطر بھٹکتی پھرتی ہے اور پاکستان جانے کی شدید خواہش رکھتی ہے۔ کیا تم اس سلسلے میں اس کی مدد نہیں کر سکتے؟ ہمیں آپ کی طرف سے کل تک جواب چاہیے"۔

"ان کے جانے کے بعد یوں لگا جیسے مجھے سانپ نے ڈس لیا ہو۔ اپنی پڑھائی اور روٹی کپڑے کے مسائل سے ہٹ کر شادی کا مجھے کبھی خیال تک نہیں آیا تھا۔ میں سوچوں میں غرق ہو گیا۔ اگلے دن جب اسلامی مرکز کے لوگوں نے مجھ سے اس سلسلے میں رابطہ کیا تو میں نے ان سے ایک مہینے کی مہلت مانگی۔ اس کے بعد میں نے

انہیں اپنا ارادہ بتانا تھا۔ میں نے اسی دن اس ساری صورتِ حال کے متعلق اپنے والدین کو خط لکھا۔ میری والدہ اور والد بہت خوش ہوئے اور انہوں نے لکھا کہ اس نیکی کے کام میں دیر نہ کروں اور یوں صفیہ بیگم سے میری شادی ہو گئی۔ آپ یقین کریں یا نہ کریں مجھے سوائے زبان کے اس سے کسی قسم کی کوئی شکایت نہیں بلکہ سوچتا ہوں شاید ہماری پاکستانی لڑکی بھی اتنی مذہب کی پابند اور سگھڑ نہ ہوگی، جتنی صفیہ ہے۔

"اتنے میں صفیہ چائے بنا لائی اور بولی "اب باقی بات پھر میں بتاؤں گی۔ اس کے بعد رفیق مجھے پاکستان لے آئے مگر میری بدقسمتی کہ وہاں میری صحت خراب ہو گئی اور مجھے واپس آنا پڑا۔ مگر میں سمجھتی ہوں کہ پاکستان میں بہت مخلص اور محبت کرنے والے لوگ رہتے ہیں۔ مجھے رفیق کے گھر والوں نے جتنی محبت دی وہ میں کبھی نہیں بھولوں گی۔ مجھے اپنے بیمار ہو جانے پر اتنی شرمندگی ہوئی کہ میں بتا نہیں سکتی۔ مگر اب میں اپنے آپ کو ذہنی اور جسمانی طور پر تیار کر رہی ہوں تاکہ پاکستان جا کر ہمیشہ کے لئے وہاں رہ سکوں۔

میں مسلمان ہوں مگر یہاں مجھے چھپ کر نماز پڑھنی پڑتی ہے۔ یہاں کبھی اذان کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ یہاں میں خیرات اور زکوة بھی میں نہیں دے سکتی۔ کوئی ہمسایہ مجھ سے تعلق رکھنے کو تیار نہیں۔ اس طرح ہمسایوں کے حقوق ادا کرنے سے بھی میں محروم ہوں۔ میرے ماں باپ مجھ سے پیار ضرور کرتے ہیں مگر میں اسلام کو چھوڑ کر ان سے ملنا نہیں چاہتی۔ پھر اس ملک کی آسائشیں اور صاف ستھرا پن میرے کس کام کا! مجھے پاکستان جانا ہے۔ ہم خوب پیسے جمع کر رہے ہیں تاکہ وہاں جا کر ایک اچھا سا گھر بنا سکیں"۔

پاکستان سے آنے کے بعد پھر وہاں جانے کی جو خواہش صفیہ کے دل میں تھی، میں نے یہ دیکھ کر دل میں کہا "صفیہ بیگم، جزاک اللہ، صد سلام تمہارے سچے جذبے کو۔ ہم تو مُسلمان گھرانے میں پیدا ہو کر، پاکستان میں رہ کر، ہر وقت غیر ملکی آسائشوں پر نظر رکھتے ہیں اور تم نو مسلم ہو کر مذہب کے لئے ہر آرام کو ٹھکرانے پر تلی ہوئی ہو۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد ادا کرنے کا موقع نہ ملنے کی وجہ سے تمہیں شدید محرومی کا احساس ستائے جا رہا ہے، ہمیں ان کا کبھی خیال بھی نہیں آیا۔ ہمیں تو اسی بات پر بہت فخر ہے کہ ہم مسلمان ہیں مگر ہم نے کبھی غور ہی نہیں کیا کہ مسلمان ہم محض اس لیے کہلا رہے ہیں کہ ہم مُسلمان

گھرانے میں پیدا ہوئے ہیں۔ خود کو سچا مسلمان ثابت کرنے کے لئے خود کیا کیا ہے؟؟"

مجھے یوں متاثر ہوتے دیکھ کر صفیہ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ وہ اندر سے ایک ڈائری اٹھا لائی جس پر چاروں قُل شریف، چھ کلمے، ایمان کی صفتیں اور کچھ دعائیں عربی اور رومن انگلش میں لکھی تھیں۔ اس نے بتایا کہ وہ روزانہ انہیں پڑھتی اور زبانی یاد کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس نے مجھے پوری نماز فر فر سنائی۔ اس کے چار سال کے بچّے نے ہمیں پہلا اور دوسرا کلمہ ترجمے کے ساتھ سنایا۔ اسلام کا مطلب بتایا۔ آنحضورؐ کا اِسم شریف بتایا۔

مجھے یوں لگ رہا تھا کہ ہم کچھ دیر اور وہاں رہے تو ندامت کے مارے میرا سانس بند ہو جائے گا۔ مجھے اس وقت اپنی دوست کے وہ دو بچّے یاد آ رہے تھے۔ جن کی ماں بڑے فخر سے ہر آنے والے کے سامنے ان سے نرسری ریم سنانے کو کہتی ہے۔ اسی طرح ہمارے گھروں کے بے شمار بچے جن کے انگریزی جملے بول لینے پر ماں باپ صدقے واری جاتے اور فخر سے سینہ تان لیتے ہیں۔ بھارتی فلموں کے گانوں کے بول کے ساتھ ڈانس کرتے ہوئے چھوٹے بچّے گھروں کی تقریبوں میں سب کی تفریح کا سامان بنتے ہیں۔

میں نے اپنے حواس جمع کرتے ہوئے انہیں اپنا لاہور اور کراچی کا پتا دیا اور ان سے گذارش کی کہ جب وہ پاکستان آئیں تو ہمیں ضرور ملیں۔ پھر ان سے جانے کی اجازت چاہی۔ ہم جاتے ہوئے دل میں یہ سوچ رہے تھے کہ وہ پاکستان آئیں گے تو ہم ان کی ہر طرح سے مدد کریں گے۔ کیوں کہ ہمارے مذہب میں نومسلم کا درجہ بہت بلند ہے۔ ہم ان کو دوسرے دن جہاز پر آنے کی دعوت دے کر رخصت ہوئے اور سارے راستے میں انہیں کے متعلق سوچتے رہے"۔ خالہ نے آج کی کہانی ختم کرتے ہوئے کہا۔

"خالہ بی، ہم سب بچّے بھی آج سے سچے اور پکّے مسلمان بنیں گے۔ نماز پڑھیں گے"۔ سب بچّے ایک زبان ہو کر بولے۔ خالہ نے محسوس کیا کہ ہمارے بچّے تو بہت نیک دل ہیں۔ اسلام کی باتیں سیکھنے کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔ ہمارے پاس ہی وقت نہیں کہ ہم ان کو مثالی باتیں اور کہانیاں سنا کر ان میں مذہبی رجحان پیدا کریں۔ انہوں نے سب بچّوں سے پیار کیا اور خود بہت پر سکون اور مطمئن سی آ کر اپنے بستر پر لیٹ گئیں۔ پھر بچّوں کے لئے نیک ہدایت کی دعا کرتے کرتے ان کی آنکھ لگ گئی۔

مینار پاکستان:

23 مارچ 1940ء کو لاہور کے شاہی قلعے اور بادشاہی مسجد کے قریب منٹو پارک (اقبال پارک) میں آل انڈیا مسلم لیگ کا ایک تاریخی جلسہ ہوا۔ اس کی صدارت قائداعظمؒ نے کی۔ اس عظیم الشان جلسے میں شیر بنگال مولوی فضل الحق نے ایک قرار دادِ پیش کی جس میں انگریزوں سے مطالبہ کیا گیا کہ ہندوستان کے جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے، انہیں ملا کر ایک آزاد اور خود مختار اسلامی ملک بنایا جائے۔ اس قرار داد نے ہندوستان کے مسلمانوں میں ایک نئی روح پھونک دی۔ بالآخر 14 اگست 1947ء کو وہ اپنے لیے ایک آزاد اسلامی ملک (پاکستان) حاصل کرنے میں کام یاب ہو گئے۔

حکومتِ پاکستان نے قرار دادِ پاکستان کی اس اہمیت کے پیشِ نظر فیصلہ کیا کہ اس جگہ جہاں مسلم لیگ کا یہ جلسہ ہوا تھا، ایک ایسی یادگار تعمیر کی جائے جو ہمیں رہتی دنیا تک اس قرار داد کی یاد دلاتی رہے۔ چناں چہ حکومت نے اقبال پارک میں ایک عالی شان مینار تعمیر کرایا اور اس کا نام "یادگار قرار دادِ پاکستان" رکھا۔ اس مینار کا نقشہ ایک ترک انجینئر نصر الدین مراد خان نے تیار کیا تھا۔ مارچ 1960ء میں اس کا سنگ بنیاد رکھا گیا اور 1968ء میں یہ مکمل ہو گیا۔ اب اسے مینار پاکستان کہا جاتا ہے۔

مُنصف موت تھی

سلیم خان گمی

طلحہ جب اسکول سے واپس آیا تو اُسے معلوم ہوا کہ اس کے دادا جان' محمّد خاں زخمی حالت میں اپنے کمرے میں پڑے ہیں۔ اس کے بھائی اسامہ نے طلحہ کو بتایا کہ دادا جان کے دونوں ہاتھ اور دونوں بازو سفید پٹیوں میں چُھپے ہوئے ہیں اور ایک سفید ڈاڑھی والا آدمی ان کے ہاتھوں اور بازوؤں پر پٹیاں باندھ کر ابھی ابھی گھر سے باہر نکلا ہے۔

"ہوا کیا بھائی؟" طلحہ نے پوچھا۔

"دادا جان سڑک پار کر رہے تھے کہ موٹر سائیکل نے زور سے ٹکر مار دی" اسامہ نے کہا۔

"سڑک سے دادا جان کو گھر کون لایا؟" طلحہ نے پوچھا۔

"رکشے والا اور اس کا ایک ساتھی" اسامہ بولا۔

"وہ کہاں گیا مارنے والا؟ موٹر سائیکل والا؟" طلحہ غصے سے بولا۔

"پتا نہیں۔ میرا خیال ہے بھاگ گیا ہوگا" اسامہ نے کہا۔

"بھاگ ہی گیا ہوگا۔ دادا جان بوڑھے ہو گئے ہیں ناں۔ اس لیے اب کسی کو پکڑ نہیں سکتے"۔

"دادا جان زمین پر گر پڑے تھے۔ اگر نہ گرتے تو اُسے پکڑ لیتے۔ وہ اب بھی ہم دونوں سے طاقت ور ہیں" اسامہ نے منہ پھلا کر کہا۔

طلحہ بڑا تھا۔ اس کی عمر 10 سال تھی۔ اسامہ چھوٹا تھا۔ اس کی عمر 8 سال تھی۔ دونوں شاہدرہ کے ایک ماڈل اسکول میں پڑھتے تھے اور اب دادا جان کے ایک حادثے میں زخمی ہونے پر دونوں ڈرائنگ روم میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ طلحہ اور اسامہ کے دادا 50 سال پہلے' 1947ء میں ضلع ہوشیار پور کے ایک گاؤں چھوٹی بستی میں رہا کرتے تھے۔ چھوٹی بستی ان کا موروثی گاؤں تھا جسے چھوڑے ہوئے یا چھوٹے ہوئے 50 سال ہو گئے تھے۔

تاہم ان کا رہن سہن، سوچ بچار، میل ملاقات اور مہمان نوازی کے طریقے نہ بدلے تھے۔

طلحہ اور اُسامہ ڈرائنگ روم سے اُٹھے اور وسیع و عریض آنگن سے ہو کر دادا جان کے کمرے میں داخل ہوئے اور سلام کیا۔

"جیتے رہو، بہادر بنو۔ خویش، قبیلے، قوم اور وطن کے کام آؤ" بوڑھے محمّد خاں نے دُعا دی۔

طلحہ اور اسامہ کے دادا محمّد خاں کے والد کا نام باز خاں تھا اور اس کے سات بیٹے تھے۔ محمّد خاں، رحمت خاں، شریف خاں، حنیف خاں، بیرم خاں، ایّوب خاں اور عنایت خاں۔ محمد خاں کے چچا الف خاں کے چار بیٹے تھے اصغر خاں، اشرف خاں، احمد خاں اور کریم داد خاں۔ باز خاں کے بیٹوں میں محمد خاں سب سے بڑا تھا۔ وہ اب طلحہ اور اسامہ کا دادا تھا۔ پاکستان بننے سے پہلے وہ چھوٹی بستی میں آرگ نائیزر تھا۔ کام کی نگرانی محمّد خاں کے چچا الف خاں کا کام تھا۔ محمّد خاں کا بھائی رحمت خاں خواتین اور بچّوں کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ سودا سلف خرید کر لاتا، میلے ٹھیلے جانا ہوتا تو سواری کا انتظام کرتا، درزیوں سے کپڑے سلواتا، وغیرہ وغیرہ۔

حنیف خاں اور شریف خاں شکاری تھے وہ سانسیوں اور اوڈوں کے ساتھ مل کر کُتّے اور گھوڑے دوڑاتے، شکار کھیلتے اور چوروں اُچکّوں کا خیال رکھتے۔ بیرم خاں کسان تھا۔ حنیف خاں اور شریف خاں اس کے مددگار تھے۔ ایّوب خاں اور عنایت خاں بھی کاشت کار تھے لیکن بیرم خاں اپنے کام میں ماہر تھا۔ وہ صبح کھیتوں میں جاتا اور رات کو لوٹتا۔ الف خاں پہلے فوج میں صوبے دار تھا۔ واپس گاؤں آیا تو کام کاج کی نگرانی پر مامور ہوا۔ اس کا ایک بیٹا اصغر خاں بھی فوج سے صوبے دار ریٹائر ہوا تھا اور اشرف خاں اور احمد خاں کے ساتھ مل کر کھیتی باڑی کرتا تھا۔ کریم داد خاں چھٹی رساں تھا جو گاؤں گاؤں، گلی گلی گھوم کر تازہ خبریں لاتا تھا۔ ایک بار وہ یہ خبر لایا تھا کہ انگریزوں نے گورداس پور کا ضلع پاکستان میں شامل کیا ہے۔ یہ خبر بعد میں ایک چوتھائی سچ ثابت ہوئی تھی۔

"دادا جان، کیا ہوا؟" طلحہ نے پوچھا جب کہ اسامہ خاموش کھڑا رہا۔

"حادثہ" دادا جان بولے۔

"کیسے؟" طلحہ نے پوچھا۔

"موٹر سائیکل چلانے والے کی غلطی سے" دادا جان نے بتایا۔

"آپ کھڑے رہے یا گر پڑے؟"

"گر رہا تھا کہ ایک راہ گیر نے سنبھال لیا۔ وہی مجھے گھر لایا" دادا جان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"راہ گیر کا تھینک یو ۔ مگر دادا جان" "آپ تو مسکرا رہے ہیں جیسے خوش ہوں کہ چوٹ لگی ہے" طلحہ نے ناراض ہوتے ہوئے کہا۔

"اگر رونا شروع کر دوں تو کیا درد کم ہو جائے گا؟ نہیں" دادا جان نے کہا۔

"یہ بات تو آپ نے سچ کہی دادا جان" طلحہ نے کہا۔

"کوئی بات ایسی ہو جو میں نے جھوٹ کہی ہو کبھی آپ دونوں سے" دادا جان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں" دونوں بھائیوں نے ایک ساتھ کہا۔

"اب آپ دونوں جائیں، آرام کریں اور میرے لیے پریشان نہ ہوں۔ میں جلد ٹھیک ہو جاؤں گا" دادا جان نے کہا۔

"اسامہ تو جا۔ میں دادا جان کے پاس بیٹھوں گا، جا" طلحہ نے کہا۔

اسامہ نے بڑے بھائی کا حکم مانا اور کمرے سے نکل گیا۔ طلحہ نے کمرے کا دروازہ بند کیا اور بوٹ اور جرابیں اُتار کر دادا جان کے پہلو میں بیٹھ گیا اور دادا جان کی سوتی گرم چادر اُوپر لے لی۔

"اب ارادہ کیا ہے آپ کا جناب طلحہ خاں" دادا نے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں۔ آپ شام کو کہانی سناتے تھے روزانہ --- اب چوٹ کی وجہ سے درد ہے اس لیے آپ کہانی نہیں گھڑ سکتے" طلحہ نے منہ بسور کر کہا۔

"اس میں پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے بھلا۔ یہ ٹھیک ہے اب میں کہانی نہیں گھڑ سکتا لیکن میں اپنی کہانی تو سنا سکتا ہوں" دادا جان نے اطمینان سے کہا۔

"اپنی کہانی؟ کون سی اپنی کہانی دادا جان؟" طلحہ نے چہرے پر تجسس لاتے ہوئے کہا۔

"میں اپنے پوتے طلحہ خاں کو اس کے دادا پڑدادا کی کہانی سنا سکتا ہوں۔ آپ نہیں جانتے ہم جہاں رہتے تھے وہاں ہندو بھی تھے اور سکھ بھی۔ ہندو سکھ اور مسلمان آپس میں لڑتے مرتے تھے مگر تھانہ اور عدالت کے باہر جو فیصلے ہوتے تھے وہ میرے والد یعنی آپ کے پڑ دادا کرتے تھے۔ وہ جو فیصلہ کرتے ہندو مسلمان اور سکھ مانتے تھے۔ کیوں کہ وہ اسلام کے سنہرے اصول' انصاف کے مطابق ہوتا تھا۔

"علاقے بھر میں ضمانت ہماری ہوتی تھی۔ اگر کسی ہندو کو سکھوں سے خطرہ ہوتا کہ ہندو کو قتل کر دیا جائے گا تو ہم ضمانت دیتے تھے کہ قتل نہیں ہوگا۔ اس غرض کے لیے ہمارے خاندان کا ایک فرد ہندو کو بطور ضمانت دے دیا جاتا۔ مطلب یہ ہوتا کہ اگر ہندو قتل ہوگا تو ہندو ہمارا آدمی بھی قتل کر سکتے ہیں۔ جب سکھوں کو معلوم ہوتا کہ ہم ہندوؤں کی جان و مال کے ضامن ہیں تو وہ قتل نہ کرتے۔ اگر سکھ کسی ہندو یا اس کے گھر کے کسی آدمی کو قتل کر دیتے تو ہمارا ضمانت پر دیا ہوا آدمی سکھوں سے لڑتا ہوا قتل ہو جاتا۔ ظاہر ہے وہ قتل ہونے سے پہلے کئی قتل کرتا اور پھر اس کے قتل کا بدلہ ہم لیتے۔ چناں چہ اس علاقے میں ہمارے خاندان کی دلیری' بہادری' شرافت اور انصاف پسندی کی وجہ سے نہ کبھی قتل ہوتا اور نہ جھگڑے ہوتے۔

"یہ تو کمال کی بات سنائی آپ نے دادا جان" طلحہ نے کہا۔

"اس کا ایک بہت بڑا نقصان بھی تھا اور وہ یہ کہ جو ہندو سکھ یا مسلمان بدمعاش تھے' ظلم کرتے تھے' لوگوں کا حق مارتے تھے' وہ ہم سے بہت ناراض تھے۔ ان کا داؤ ہماری وجہ سے نہ چلتا تھا" دادا جان نے بتایا۔

"اس کا کبھی کوئی نقصان ہوا آپ کو؟" طلحہ نے پوچھا۔

"اگر ہم بہادر اور دلیر نہ ہوتے اور قول کے کچے ہوتے تو یقیناً بہت نقصان ہوتا لیکن اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنی رحمت کے طفیل ہمیشہ بچایا۔ البتہ جب 14 اگست 1947ء کو معلوم ہوا کہ ہوشیار پور بھارت میں شامل ہو گیا ہے تو ہمیں ہوشیار پور چھوڑنا پڑا"۔

"تب کیا نقصان ہوا دادا جان؟" طلحہ نے پوچھا۔

"تب ہندو اور سکھ جو بدمعاش تھے وہ ہم پر ٹوٹ پڑے۔ انہوں نے چھوٹی بستی کا گھیراؤ کر لیا اور طے کیا کہ وہ ہماری بستی کے مردوں عورتوں اور بچوں کو جان سے مار ڈالیں گے اور ہمارے گھر جلا دیں گے۔ ان لوگوں کا لیڈر ایک سکھ مکھن سنگھ تھا جو بدمعاش تھا اور جیل سے بھاگا تھا۔ تب کوئی حکومت تو تھی نہیں۔ اس نے علاقے کے دوسرے بدمعاشوں کو اکٹھا کر کے اپنا گروہ بنایا۔ ہتھیار اکٹھے کیے اور مسلمانوں کو ہلاک کرنا شروع کر دیا۔ وہ دن کو پیچھے ہٹ جاتے اور رات کو ہمارے گاؤں' چھوٹی بستی کا محاصرہ کر لیتے۔

"ایک دن دوپہر کو آپ کا پڑدادا باز خاں گھوڑے پر سوار ہو کر مکھن سنگھ سے ملنے کے لئے روانہ ہوا۔ آپ کو بتا دوں کہ ہمارے پاس دس گھوڑے' دو خچریں اور چار شکاری کتے تھے۔

"تو میں کہ رہا تھا کہ ابا دن کو گھوڑے پر سوار ہو کر مکھن سنگھ سے ملنے گئے گیا۔ مکھن ایک بہت بڑی

پاکستان گولڈن جوبلی 50 1997 - 1947

حویلی میں تخت نما پلنگ پر لیٹا ہوا تھا۔ یہ حویلی نواب علی چودھری کی تھی جو تین دن پہلے گاؤں چھوڑ کر پاکستان جا چکا تھا۔ مکھن سنگھ نے میرے والد کو دیکھا تو کھڑا ہو کر بولا "باز خاں، زندگی کی بھیک مانگنے آئے ہو؟"

"نہیں مکھن سنگھ تجھے مارنے آیا ہوں" ابا نے یہ کہا اور پستول سے فائر کر کے فوراً مکھن کو جان سے مار ڈالا۔ اس کے ساتھی سناٹے میں آ گئے۔ ابا نے پھر یکے بعد دیگرے دو فائر کئے اور دو سکھ بدمعاشوں کو گرا دیا۔ باقی بھاگ گئے۔ میرے والد واپس آ گئے اور چھوٹی بستی آ کر اسی وقت حکم دیا کہ سفر اختیار کرو اور ہم دن کے وقت پاکستان کے لئے چل پڑے۔ کسی نے ہمارا راستہ نہ روکا۔ ہوشیار پور کے سکھوں کو معلوم ہو چکا تھا کہ باز خاں نے مکھن سنگھ بدمعاش اور اس کے دو ساتھیوں کو جان سے مار دیا ہے۔ بھگوڑے سکھوں نے سب کو اطلاع کر دی تھی۔

جب ہم گھوڑوں، خچروں اور کتوں کے ساتھ جالندھر سے کچھ دور آدھی رات کے بعد، حبیب اللہ خاں کے قلعہ نما گھر میں داخل ہوئے تو ہمیں معلوم نہ تھا کہ وہ دو دن پہلے پاکستان کے لئے روانہ ہو چکا ہے اور اس کے گھر پر "نہنگوں" کا قبضہ ہے"۔

"یہ نہنگ کون ہوتے ہیں دادا جان؟" طلحہ نے پوچھا۔

"یہ بھی سکھ ہوتے ہیں۔ یہ سکھ مت کے بانی بابا نانک کو مانتے ہیں لیکن بابا نانک سے زیادہ گورو گوبند سنگھ کی تعلیم پر عمل کرتے ہیں یعنی دشمن کو مارنے کے لئے ہر وقت، ہر دم تیار رہتے ہیں۔ شادی نہیں کرتے۔ تلوار سے ہتھیار بند رہتے ہیں۔ جسے "کرپان" کہتے ہیں۔ نیزہ، برچھا اور لٹھ بھی استعمال کرتے ہیں۔ کچھ بھنگ، چرس اور افیون بھی پیتے، کھاتے ہیں"۔

"پھر کیا ہوا؟"

"مردوں عورتوں اور بچوں کو پتا چلا تو ظاہر ہے وہ بہت گھبرائے۔ اِن نہنگوں کا سردار ایک سکھ دسیا سنگھ تھا۔ وہ ابّا سے ملا اور بولا "ہم تو تیری طرف جا رہے تھے۔ باجے خاں تو خود ہمارے پاس آ گیا۔ تو کہا کرتا ہے ہماری پہچان، مسلمان۔ اب مرنے کے لئے تیار ہو جا"۔

"مرنے کے لئے نہیں، دسیا سنگھ، شہید ہونے کے لئے" ابا نے گھبرائے بغیر دسیا سنگھ سے کہا۔

"ہم تجھ اکیلے کو نہیں ماریں گے۔ تیرے تمام آدمیوں کو ماریں گے۔ لیکن عورتوں کو چھوڑ دیں گے، بیچنے کے لئے" دسیا سنگھ نے مونچھوں کو تاؤ دے کر کہا اور تلوار میان سے نکالی۔

"ہماری عورتیں زندہ نہیں رہیں گی۔ ان کے پاس ہتھیار ہیں۔ وہ اپنے ہاتھوں خود اپنی زندگیاں ختم کریں گی۔ یہ بات طے ہے۔ کیوں کہ وہ مسلمان عورتیں ہیں" ابا نے پھر کسی خوف کے بغیر کہا۔

"بات تو باجے خاں ہم طے کریں گے۔ آپ لوگ خرگوش ہیں اور شیر کی کچھار میں آ گئے ہیں۔ ہم مکھن سنگھ، اور اس کے دو سرداروں لبھا سنگھ اور دسوعہ سنگھ کا بھی بدلہ لیں گے۔ جن کو تو نے گولیوں سے بھون ڈالا" دسیا سنگھ نے کہا

"یہ تو بہادری نہ ہوئی" ابا نے کہا "بہادری یہ ہے کہ ایک کا ایک سے مقابلہ ہو اور وہ مقابلہ تلوار سے ہو"۔

"ہمارے پاس ہتھیار زیادہ ہیں اور آدمی بھی زیادہ ہیں۔ تیرے آدمی میرے آدمیوں سے لڑیں، میرے آدمی تیرے آدمیوں سے۔ جو جیت جائے وہ جیت جائے" دسیا سنگھ نے کہا۔

"میں پھر کہوں گا یہ بہادری نہیں۔ گورو گوبند سنگھ جی آج زندہ ہوتے تو اسے بہادری نہیں بزدلی کہتے" ابا نے گورو گوبند سنگھ کا نام خاص طور پر اس لیے لیا تھا کہ وہ اپنے اس گورو کو دل و جان سے مانتے تھے۔ دسیا سنگھ چپ ہو گیا۔

"بولو، میں نے غلط کہا یا صحیح" ابا نے کہا۔

"صحیح کہا باز خاں تو نے" دسیا سنگھ بولا۔

"پھر ایک کا ایک سے مقابلہ کرو۔ جو ہار جائے اس کی ٹیم ہار جائے اور گردنیں جھکا کر شکست مان لے۔ ہم ہار گئے تو ہمیں شہید کر دینا۔ تم ہار جاؤ تو ہمیں امرتسر جانے دینا۔ آگے ہماری قسمت" ابّا نے کہا اور دسیا سنگھ نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کر کے بات مان لی۔

ہمارے چچا الف خاں کا مقابلہ رنجیت سنگھ نہنگ سے ہوا۔ دونوں کے ہاتھوں میں تلواریں تھیں۔ مشعلیں جل رہی تھیں۔ ایک طرف ہم بارہ آدمی کھڑے تھے۔ دوسری طرف ایک سو نہنگ تھے۔ مُنصِف موت تھی۔

ایک گھنٹے تک شمشیر زنی کا مقابلہ ہوا اور آخر چچا الف خاں زمین پر اوندھے منہ گرے۔ رنجیت سنگھ نے کرپان سے ان کی گردن پر وار کیا۔ چچا نے بجلی کی تیزی سے پلٹ کر اپنی تلوار رنجیت سنگھ کے سینے میں آرپار کر دی۔ وہ گر کر تڑپا اور ٹھنڈا ہو گیا۔ دسیا سنگھ رنجیت سنگھ کی لاش سے لپٹ کر رونے لگا۔ ابا نے اشارہ کیا۔ ہم سب گھوڑوں خچروں اور کتوں کو لے کر قلعہ نما گھر سے باہر آگئے اور سفر ایک بار پھر جاری ہوا۔

جب صبح کے سورج کی کرنوں نے ہر طرف اُجالا کیا تو ہم جالندھر کے ایک سرحدی گاؤں میں داخل ہوئے جو مسلمانوں کا تھا اور خالی تھا۔ مسلمان جا چکے تھے۔ لیکن ان کا آٹا، دال، نمک، مرچ، شکر، گڑھ، گھی، تیل، برتن اور مویشی گاؤں میں ہی تھے۔ لگتا تھا انہوں نے جلدی میں رات سفر اختیار کیا ہے۔ آپ کی دادی، بانو، نے عورتوں سے مدد لے کر کھانا تیار کیا۔ سب نے پیٹ بھر کر کھایا۔ ابا نے پہرا بٹھایا اور دوسرے لوگ آرام کرنے لگے۔ کیوں کہ وہ رات بھر جاگتے رہے تھے اور سفر سے چور تھے۔

دوپہر کے بعد ابا نے پہرا بدل دیا۔ جو پہرے دار تھے، وہ پانچ تھے۔ اب وہ سو گئے اور دوسرے پانچ جوان پہرے پر کھڑے ہو گئے۔ شام کو سبھی تر و تازہ تھے۔ آپ کی دادی، بانو نے کھانا تیار کیا۔ سب نے پیٹ بھر کر کھایا اور چلنے کی تیاری کی۔ عین اس وقت دس گھڑ سواروں کا ایک جتھا آیا اور وہ ہم پر حملہ آور ہوا۔ یہ گھڑ سوار ٹیڑھی سرخ پگڑیاں باندھے ہوئے تھے۔ ابا نے کہا "ہندو راجپوت ہیں یہ

منہاس ہیں۔ خوب لڑتے ہیں لیکن ہم ان سے بہتر ہیں"۔
پھر ان کے ساتھ مقابلہ ہوا۔ آٹھ ہندو راجپوت مارے گئے دو زندہ پکڑ لیے۔ پوچھ گچھ ہوئی۔ وہ واقعی منہاس راجپوت نکلے۔ ابا نے ان کی پگڑیاں لے کر ان سے ہمارے سروں پر ٹیڑھی پگڑیاں بندھوائیں۔ اب لگتا تھا ہم ہندو راجپوت ہیں اور مار دھاڑ کے لئے اپنے گھروں سے نکلے ہیں۔

"دادا جان، کمال سوچ تھی آپ کے ابا جان کی" طٰہٰ حیران ہو کر بولا۔

"ہاں، وہ بہت عقل مند تھے۔ ان کا ذہن خوب کام کرتا تھا"۔

"ان دو راجپوتوں کا کیا ہوا؟" طٰہٰ نے پوچھا۔

"کیا ہونا چاہئے تھا؟" دادا نے کہا۔

"ان کو چھوڑ دیا ہوگا پڑدادا نے۔ کیوں کہ ان سے ٹیڑھی پگڑیاں بندھوائی تھیں" طٰہٰ نے کہا۔

"نہیں، اگر ان کو چھوڑ دیا جاتا تو وہ جاسوسی کرتے۔ اپنے آدمی اکٹھے کر کے نیا ٹولہ بناتے اور ہمیں قتل کرنے کے لئے آجاتے۔ ان کو گولیوں سے اڑا دیا تھا"۔

"چلو ٹھیک ہے۔ پھر کیا ہوا؟" طٰہٰ نے سوال کیا۔

"پھر ہونا کیا تھا۔ ہم پکی سڑک پر سفر کرتے رہے اور آخر کار امرتسر اور گورداس پور کی سرحد پر پہنچ گئے"۔

"راستے میں کسی نے روکا نہیں آپ لوگوں کو" طٰہٰ نے پوچھا۔

"نہیں جو دیکھتا تھا سمجھتا تھا کہ ہندو راجپوت ہیں۔ مسلمان عورتوں اور بچوں کو غلام لونڈی بنا کر لائے ہیں اور لوٹ مار کر کے اپنے گاؤں جا رہے ہیں۔ سفر رات کا تھا۔ صبح ہوئی تو سڑک سے ذرا ہٹ کر کماد کے کھیت میں پناہ لی۔ جو باسی روٹیاں اور سالن ساتھ تھا اس سے پیٹ بھرا۔

ہم شام کو سوچ رہے تھے کہ رات کو سفر کیا جائے یا کماد کے کھیت میں رات بسر کی جائے کہ کریم داد خاں اطلاع لایا کہ دو میل دور ریلوے اسٹیشن ہے جہاں سے آدھی رات کو گاڑی گورداس پور روانہ ہوگی۔ ریلوے اسٹیشن امرتسر کی حدود میں ہے۔ چناں چہ طے ہوا کہ ریلوے اسٹیشن پر جا کر گاڑی کا انتظار کیا جائے۔

جب اسٹیشن پر پہنچے تو یہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ دو شکاریوں، حنیف خاں اور بیرم خاں نے گھوم پھر کر دیکھا۔ وہاں نہ اسٹیشن ماسٹر تھا اور نہ ہی مسافر۔ قریب ہی دو تین مکان تھے جو خالی تھے۔ ایک بھری پری دکان تھی۔ ان دونوں نے پلیٹ فارم پر تیل والے چار لیمپ جلائے اور آگئے۔ ہم سب اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں بیٹھ کر گاڑی کا انتظار کرنے لگے۔

اب مکان کی آگ سے پلیٹ فارم خوب روشن تھا۔ اس روشنی میں گاڑی کی روشنی شامل ہوئی تو اور روشن ہو گیا۔ ہم سب ایک ڈبے میں بیٹھ گئے۔ گاڑی تین منٹ بعد روانہ ہوگئی۔ ہمارے گھوڑے اور خچر پلیٹ فارم پر ہی تھے۔ ان کو ہم نے کھلا چھوڑ دیا تھا۔ البتہ چار شکاری کتے ڈبے میں ہمارے ساتھ تھے۔ شریف خاں اور حنیف خاں کو اتنا پیار تھا ان کتوں سے کہ وہ ان کے لیے اپنی جان بھی داؤ پر لگا سکتے تھے۔

گورداس پور پہنچے تو ہم نے اپنی راجپوتی شان والی ٹیڑھی پگڑیاں پٹڑی پر پھینک دیں اور اپنی سیدھی سادی شملے والی پگڑیاں باندھ لیں کہ ہم اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق اب پاکستان آگئے تھے۔

سب سے پہلے میں پلیٹ فارم پر اُترا، میرے بعد دوسرے لوگ، آخر میں ابا۔ مجھے پلیٹ فارم پر صدیق خاں سانسی ملا۔ وہ ایک قصبہ بہرام پور کا رہنے والا تھا۔ اس کی بیوی پٹھانی نہ تھی بلکہ سانسیانی تھی۔ اس لیے اسے صدیق خان سانسی کہا جاتا تھا۔ وہ چور بھی تھا اور ڈاکے بھی ڈالتا تھا۔ دو آدمیوں کو قتل بھی کر چکا تھا۔ وہ ہر وقت پولیس کی نظر میں رہتا تھا۔ جب وہ اشتہاری ملزم تھا تو چھوٹی بستی میں آیا تھا اور اس نے پناہ مانگی تھی اور ہم نے اُسے پناہ دی تھی، چھ مہینوں کے لیے۔

"سانسی! تو کہاں؟" میں نے پوچھا "اور اتنا گھبرایا ہوا کیوں ہے تو؟"

"کیا تم کو معلوم نہیں؟ گورداس پور کی تین تحصیلیں پٹھان کوٹ، بٹالہ اور یہ گورداس پور بھارت میں آ گئی ہیں۔ صرف ایک تحصیل شکر گڑھ پاکستان کو ملی ہے اور وہ راوی کے اس پار ہے۔ ہندو، سکھ اور انگریز ہمارے دشمن ہیں۔ یہاں سے نکلو۔ جان بچاؤ"۔

"کیسے؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"آپ کتنے لوگ ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"ہم کل تیس ہیں" میں نے بتایا۔

"پانچ تانگے کافی ہوں گے۔ باہر اڈے میں چھ تانگے میں نے دیکھے ہیں۔ ان پر قبضہ کرتے ہیں اور ان پر بیٹھ کر یہاں سے آٹھ میل دور تموں پتن چلتے ہیں۔ تموں پتن سے راوی پار کریں گے۔ راوی کے اس پار پاکستان ہے۔ پاکستان کا پہلا قصبہ کوٹ نناں ہے۔ ٹھیک ہے ناں؟" صدیق بولا۔

میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے تھے۔ کیوں کہ ہتھیار بند ہندو اور سکھ ادھر ادھر خوں خوار آنکھوں سے ہمیں گھورتے ہوئے گزر رہے تھے۔ صدیق خاں نے ہم سب کو ساتھ لیا کیوں کہ تانگوں کے اڈے کا صرف اسے ہی علم تھا۔ ہم اڈے تک بھاگ کر آئے۔ واقعی وہاں تانگے کھڑے تھے۔ وہ چھ نہیں سات تھے اور ان کے مالک سکھ تھے جو تانگے چھوڑ کر لوٹ مار میں مصروف تھے۔ وہ لوٹ مار کا سامان ان تانگوں پر لاد کر گھروں کو لے جاتے تھے۔ تانگوں میں گھوڑے جتے ہوئے تھے، بالکل تیار۔

ہم نے جلدی سے عورتوں اور بچوں کو تانگوں میں بٹھایا۔ کتے بھی ساتھ تھے۔ صدیق خاں پہرے دار کی طرح ادھر ادھر چوکنا ہو کر دیکھ رہا تھا۔ اچانک کوچوان کرپانیں لے کر حملہ آور ہوئے۔ شریف خاں اور حنیف خاں نے اپنے شکاری کتوں کو للکارا کہ وہ کوچوانوں پر چڑھ دوڑیں۔ وہ گولی کی طرح سکھ کوچوانوں کی طرف لپکے۔ صدیق خاں سانسی بھی تلوار لے کر ان کا مقابلہ کرنے لگا۔ ہم نے تانگوں میں جتے گھوڑوں کو شِشکار کر بھگایا۔ چھ تانگے گھوڑوں کے پیچھے سرپٹ بھاگنے لگے۔ صدیق خاں سانسی اور تین کتے لڑتے ہوئے ڈھیر ہو گئے اور ایک کتا ہمارے تانگوں کے پیچھے بھاگتا رہا۔

جب پو پھٹی تو چھ تانگے اور ایک کتا تموں پتن پر تھے۔ ابا نے ملاحوں کا پتا کیا۔ وہ ایک پھیرے کا ایک ہزار

مانگتے تھے۔ اس زمانے میں ایک ہزار آج کے تقریباً پچاس ہزار روپوں کے برابر تھا۔ ابا نے ایک ہزار روپے ادا کیے اور ہم نے کشتی میں بیٹھ کر دریائے راوی کو پار کیا۔

اس وقت کوٹ نناں کے باہر آموں کا باغ تھا۔ اس باغ کے کنارے ایک اسکول تھا۔ سارا دن اور ساری رات وہاں گزاری اور دوسرے دن کوٹ نناں کے پاس ایک گاؤں بگیال پہنچے۔ یہ سکھوں کا گاؤں تھا۔ جب ہم وہاں پہنچے تو آدھا گاؤں خالی ہو چکا تھا اور آدھا گاؤں قید میں تھا۔ قیدی سکھ مرد، عورتیں اور بچے تھے اور قیدی بنانے والے آس پاس کے بدمعاش اور غنڈے تھے جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے تھے۔ پتا کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ تین سکھوں کو اب تک قتل کر چکے ہیں اور باقی عورتوں، مردوں اور بچوں کو قتل کرنا چاہتے ہیں کیوں کہ جو سکھ گاؤں چھوڑ کر جا چکے تھے ان کا روپیا پیسا اور سونا زیور بھی ان سکھوں کے پاس تھا جو ابھی بگیال میں تھے اور اب ان غنڈوں نے انہیں گھیرا ہوا تھا۔

"آپ نے پھر کیا کیا دادا جان؟ آپ نے بھی ان مسلمانوں کا ساتھ دیا ہوگا کیوں کہ آپ بھی تو بڑی مشکل سے سکھوں سے بچ کر آئے تھے" طلحہ نے کہا۔

"پیارے طلحہ خاں، اسلام امن اور سلامتی کا مذہب ہے۔ ظلم اور زیادتی کا مذہب نہیں۔ کسی کو بے

بس پا کر اس پر ظلم ڈھانا مسلمان کا کام نہیں۔ ہم نے ان بے بس سکھوں کا ساتھ دیا اور وہ یوں کہ ابا نے ان مسلمان حملہ آوروں سے کہا کہ یہ لوگ ذمّی ہیں۔ اسلام کے مطابق ان کی حفاظت ہماری ذمّے داری ہے"۔

"پھر" طلحہ نے کہا۔

"پھر کیا۔ وہ نہ مانے۔ ان کی نظروں میں دولت ناچ رہی تھی۔ ابا نے سکّھوں کی ایک سیانی عورت جسونت کور سے بات کی۔ اس نے کہا "ہم اپنی اور ان لوگوں کی جو یہاں سے جا چکے ہیں ساری دولت دیتے ہیں۔ آپ ان لوگوں سے ہمیں راوی پار جانے کی اجازت لے دیں"۔

ابا نے جسونت کور کی بات ان بدمعاشوں کے سردار بلند خاں کو بتائی۔ وہ بولا "جسونت کور کو ہم جانتے ہیں۔ وہ کچھ دولت ہمیں دے گی باقی نیفوں میں چھپا کر لے جائے گی۔ ہمیں یہ بات منظور نہیں"۔

ابّا نے بلند خاں کی منّت سماجت کی لیکن وہ نہ مانا۔ بلند خاں سے ملنے کے بعد واپس آ کر ابّا نے کہا "بچّو، لڑنے مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ میں سکّھوں کو حفاظت کی زبان دے چکا ہوں۔ وعدہ کر چکا ہوں اور یہ ایک مُسلمان کا وعدہ ہے۔ اب مُنصِف موت ہوگی"۔

"نہتّے سکّھوں پر جب بلند خاں اور اس کے غنڈوں نے حملہ کیا تو ہم آڑے آئے۔ دھماکا خیز مقابلہ ہوا۔ بلند خاں میری تلوار سے مرا۔ دو اور غنڈے شریف خاں اور ایّوب خاں نے مارے۔ باقی بھاگ نکلے۔ لیکن ابّا شدید زخمی ہوئے۔ اُنھوں نے مرتے ہوئے کہا "پہلے جسونت کور اور اس کے لوگوں کو راوی پار بھجواؤ اس کے بعد میری طرف توجہ دو"۔

جب شام سے پہلے سورج کی سرخ کرنیں مشرق کو لالہ زار بنا رہی تھیں تو جسونت کور اور دوسرے سکھ مرد، عورتیں اور بچّے راوی پار کر گئے اور ہم نے واپس آ کر ابا کو بتایا تو اُنھوں نے اطمینان سے کلمہ پڑھا اور اللہ کو پیارے ہو گئے۔

پیارا دیس

ہم سب کی عزّت اور شان
پیارا دیس ہے پاکستان

اس کے چاروں ہی صُوبے
اُجلے، پیارے، چمکیلے
جیسے جنّت کے ٹکڑے
یہ ہے سب کی پہچان
پیارا دیس ہے پاکستان

شہر ہوں، گاؤں یا کوُچے
دریا اور پربت اس کے
ہم کو لگتے ہیں اچھّے
قائداعظمؒ کا احسان
پیارا دیس ہے پاکستان

یہ قلعہ اسلام کا ہے
چرچا اِس کے نام کا ہے
دیس بہت یہ کام کا ہے
اس پر میری جاں قرباں
پیارا دیس ہے پاکستان

لوگو! اِس کی قدر کرو
مت آپس میں لڑو مرو
خوفِ خدا سے کچھ تو ڈرو
مت بیچو اپنا ایمان
پیارا دیس ہے پاکستان

ضیغم حمیدی

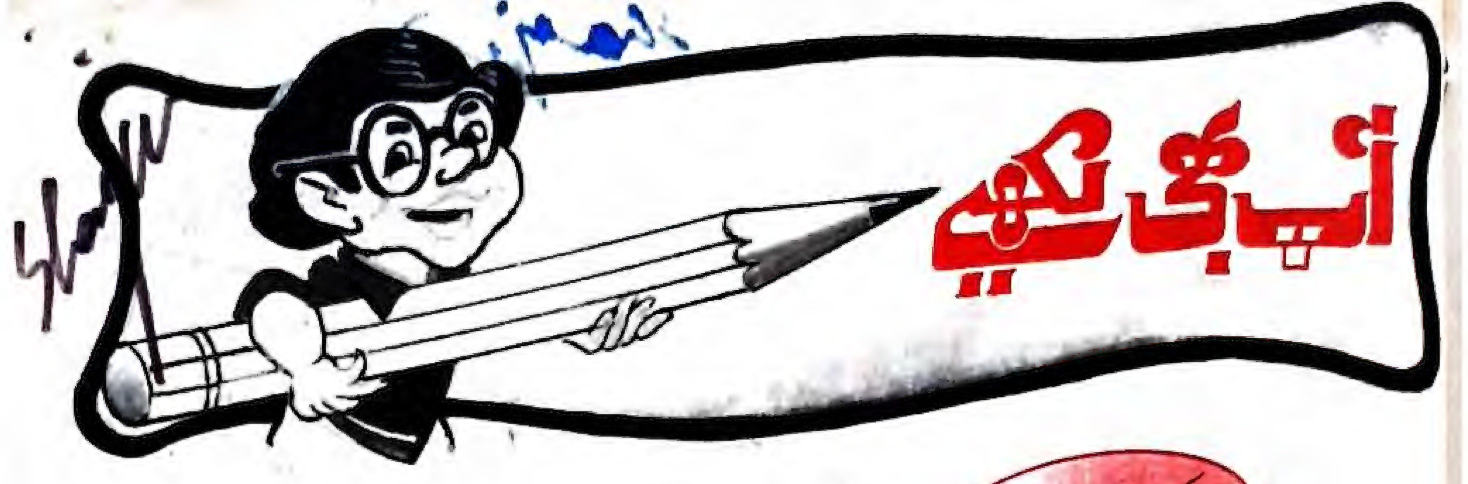

کس کا وطن

محمد معروف چشتی، حویلی لکھا

آج پورے 50 سال کے بعد پیر بخش کی آنکھوں نے دن کی روشنی کو دیکھا تھا۔ اس کے تصور میں 50 سال سے پہلے کے واقعات آنے لگے۔ جب وہ ایک کڑیل نوجوان تھا اور پورے زور شور سے تحریک پاکستان میں حصہ لے رہا تھا۔ وہ بی اے میں تھا جب تحریک پاکستان نے زور پکڑا۔ اس نے اپنے آپ کو مسلم لیگ کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اسی دوران میں اسے کئی مرتبہ قائداعظمؒ سے ملاقات کا شرف بھی حاصل ہوا۔ اس طرح اس کا شوق آزادی اور بھڑک اٹھا۔ وہ کراچی کے ایک نواحی گوٹھ میں رہتا تھا۔ اس نے اپنے گاؤں اور آس پاس کے دیہات کے لوگوں میں بھی آزادی کی اہمیت اور علیحدہ وطن کے مقصد کو اجاگر کیا۔ اس کی یہ باتیں گاؤں کے وڈیرے کو بہت ناگوار گزرتیں۔ وڈیرا اگرچہ مسلمان تھا مگر اب انگریزوں کا زرخرید غلام بن چکا تھا۔ اسے تحریک پاکستان کو دبانے کے عوض پانچ گاؤں اور تیس ایکڑ زمین بطور انعام مل چکی تھی۔

وڈیرے کے آدمیوں نے پیر بخش کو بہت دفعہ خبردار کیا تھا مگر پیر بخش "لے کے رہیں گے پاکستان..... بن کے رہے گا پاکستان" کی عملی تصویر بن چکا تھا۔ آخر ایک دن وڈیرے نے پیر بخش اور اس کے گھر والوں کو اپنے ڈیرے پر بلایا اور اس کے بوڑھے والدین کو مار مار کر زندگی کی قید سے آزاد کر دیا۔ یہ دیکھ کر پیر بخش کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر وڈیرے کا منہ نوچ لیا اور ابھی دو چار گھونسے ہی لگائے تھے کہ وڈیرے کے پالتو چمچوں نے پیر بخش کو زنجیروں میں جکڑ کر وڈیرے کی ذاتی جیل میں ڈال دیا۔

اسے وقتاً فوقتاً کسی نہ کسی ذریعے باہر کی خبریں ملتی رہتی تھیں۔ آخری خبر جو اسے ملی وہ پاکستان بن جانے کی تھی۔ یہ خبر سن کر وہ سجدے میں گر گیا اور دیر تک خدا کا شکر ادا کرتا رہا۔ مگر اس کے بعد اسے کوئی خبر نہ ملی۔ پیر بخش سے ملاقات پر پابندی لگ چکی تھی۔ کیوں کہ وڈیرے کو شک ہو گیا تھا کہ اس کے ملازم اسے بھگانے کی سازش کر رہے ہیں۔ جب کہ وڈیرے نے تو اسے جیتے جی مارنے کا فیصلہ کر کے قید میں ڈالا تھا۔ وڈیرے کے ظلم و ستم سے تنگ آکر اس کے ایک ملازم نے اسے زہر دے دیا اور وڈیرے کی موت کے چند سال بعد اس کے بیٹوں نے پیر بخش کو آزاد کر دیا تھا۔

پیر بخش کا چہرہ یہ سوچ کر خوشی سے ٹمٹمانے لگا کہ اب وہ اپنے آزاد وطن میں ہے۔ وہ ہمت کر کے اٹھا اور ایک کشادہ گلی کی طرف چلا۔ تھوڑی ہی دور گلی کے آگے سے سڑک گزر رہی تھی جو اس بات کی علامت تھی کہ یہ گاؤں سے باہر جانے کا راستہ ہے۔ گلی میں سے گزرتے ہوئے اسے چند بچوں نے حیرانی سے دیکھا اور "پاگل، پاگل" کہتے ہوئے اس کے پیچھے لگ گئے۔ کیوں کہ اس کے سر اور ڈاڑھی کے بال بہت بڑھ چکے تھے۔ مگر اس نے بچوں کی اس حرکت کا برا نہ مانا۔ بلکہ اپنے وطن کے معصوم فرشتوں کو پیار سے دیکھنے لگا۔

جلد ہی وہ گاؤں سے باہر آ گیا۔ وہ جلد از جلد شہر پہنچ کر اپنے قائدؒ سے ملنا چاہتا تھا۔ تاکہ انہیں پاکستان بننے کی مبارک دے سکے۔ بڑی سڑک پر پہنچ کر اس نے ایک سائیکل سوار سے پوچھا "بیٹا' یہ سڑک شہر کی طرف جاتی ہے؟"

"جی' بابا جی' ادھر ہی جاتی ہے" سائیکل والے نے کہا۔

یہ سن کر پیر بخش شہر کی جانب چل پڑا۔ سائیکل سوار نے ٹھہر کر کہا "بابا جی آپ کو شہر جانا ہے تو پیچھے بیٹھ جائیں' میں بھی شہر ہی جا رہا ہوں"۔

"جیتے رہو بیٹا۔ خدا تمہیں لمبی عمر دے" پیر بخش یہ کہتے ہوئے اس کی بائی سکل کے پیچھے بیٹھ گئے۔ کچھ دیر کے بعد وہ شہر پہنچ گئے۔ سائیکل سوار بولا "بابا جی شہر آ گیا ہے آگے آپ نے کہاں جانا ہے؟"

"بس بیٹا یہیں اتار دو' بڑی مہربانی" پیر بخش نے کہا۔

پیر بخش چند لمحے فٹ پاتھ پر کھڑا ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ اسکولوں میں چھٹی ہو چکی تھی۔ بچے اپنے بستے سنبھالے گھروں کو جا رہے تھے۔ اسے سب کچھ بہت عجیب لگ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ تھوڑی دیر رکنے کے بعد وہ آگے چل پڑا۔ اس نے ایک راہ گیر سے پوچھا "بیٹا قائداعظمؒ کہاں ہوں گے؟"

راہ گیر نے بابے کو اوپر سے نیچے تک دیکھا اور پھر خاموشی سے آگے بڑھ گیا۔ وہ سمجھا کہ شاید کوئی پاگل ہے۔ پیر بخش نے پھر ایک راہ گیر سے یہی پوچھا مگر وہ یہ کہ کر چل دیا "معاف کر بابا"۔

پیر بخش کو یہ سن کر بہت افسوس ہوا۔ پھر اس نے اپنے وطن کی دیواروں پر ایک دوسرے کے خلاف نفرت اور تعصب کے نعرے پڑھے۔

"نہیں یہ میرا وطن نہیں ہو سکتا"۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ کسی چیز سے ٹکر مار کر مر جائے۔ مگر وہ اپنے قائد سے ملنا چاہتا تھا۔ پھر وہ ایک کانسٹیبل کی طرف بڑھا اور کہا "بیٹا خدا کے لیے مجھے قائداعظمؒ کا پتا بتا دو"۔

"بابا جی ایک طرف ہٹ جاؤ ورنہ ابھی کسی گاڑی سے ٹکرا کر اپنے قائد کے پاس پہنچ جاؤ گے"۔ کانسٹیبل نے اسے جھڑک دیا۔ وہ دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا اور رونے لگا۔

"یا الٰہی یہ کیا ہو رہا ہے؟ میں کہاں آ گیا ہوں؟" وہ مسلسل آہ و بکا کر رہا تھا۔ اتنے میں دو بچے اپنے کندھوں پر بھاری بھرکم بستے اٹھائے اس کے پاس آ کر رکے "کیا بات ہے بابا جی' آپ کیوں رو رہے ہیں؟" ایک بچے نے نہایت معصومیت سے پوچھا۔

پیر بخش نے ان کی طرف دیکھا اور مسکرا دیا۔ اس کے ہونٹ کپ کپا رہے تھے اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ "بیٹا مجھے... مجھے بتاؤ قائداعظمؒ کہاں ہیں؟"

"قائداعظم... کون سے قائداعظم بابا جی؟"

"بیٹا جنہوں نے ہمارا پیارا وطن بنایا ہے"۔

"وہ تو کب کے فوت ہو چکے ہیں" ایک بچے نے معصومیت اور حیرانی سے کہا۔

"کیا؟" پیر بخش زور سے چیخا "نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ تم کیا کہ رہے ہو' ایسے لوگ کبھی نہیں مرتے" پیر بخش دیوانگی کے عالم میں چلانے لگا۔

"آیئے بابا جی' ہم آپ کو ان کے مزار تک لے چلتے ہیں" دوسرے بچے نے کہا۔

"ہاں... ہاں بیٹا مجھے لے چلو۔ میں ان سے ملوں گا۔ وہ زندہ ہیں۔ وہ نہیں مر سکتے۔ وہ یقیناً زندہ ہیں" پیر بخش یہ کہتے ہوئے ان کے ساتھ ہو لیا۔ وہ مختلف راستوں سے ہوتے ہوئے مزار قائد تک پہنچے۔ مرقد کو دیکھتے ہی پیر بخش جلدی سے لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ اس کی طرف بڑھا۔

"قائدؒ..... میرے پیارے قائدؒ' یہ..... یہ آپ نے کیا کیا؟ آپ مجھے چھوڑ کر کہاں چلے گئے۔ آپ کیوں چلے گئے؟ میں اس ملک میں نہیں رہنا چاہتا۔ یہ میرا وطن نہیں..... یہ آپ کا وطن نہیں ہے؟"

اس کی چیخ پکار سے مزار میں کافی شور مچ گیا۔ پہرے پر موجود ایک فوجی جوان نے اسے اٹھایا اور مزار سے باہر لے آیا۔ پیر بخش روتا ہوا سڑک پر آگیا۔ اس کی زبان پر مسلسل یہ کلمات جاری تھے "یا اللہ میرے حال پر رحم فرما۔ مجھے میرے قائدؒ سے ملا دے۔ میں اس ملک میں نہیں رہنا چاہتا"۔

اور پھر کراچی کی فضا گولیوں کی گونج سے کانپ اٹھی۔ ایک گولی نے پیر بخش کی بوڑھی ہڈیوں کو توڑ کر اس کے دل میں جگہ بنالی۔ وہ زمین پر گر پڑا۔ اس نے سر اٹھا کر آخری بار امید بھری نگاہوں سے مزار قائد کی طرف دیکھا جیسے کہ رہا ہو "میرے قائد، میں آ رہا ہوں"۔ اور کلمہ پڑھ کر سر زمین پر رکھ دیا۔ (پہلا انعام: 50 روپے کی کتابیں)

تبدیلی

محمد طاہر سلیم، پل دولے والا قصور

عامر اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ وہ دسویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ اس کے امی اور ابو اس سے بہت پیار کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے بیٹے کے آرام کے لیے ہر چیز مہیا کی ہوئی تھی۔ لیکن بے جا لاڈ اور پیار کا عامر پر الٹا اثر ہوا۔ وہ نماز کی طرف بالکل توجہ نہیں دیتا تھا۔ ہر وقت انڈیا کے گانے سنتا رہتا تھا۔ عامر کے دادا کا دل اس بات سے بہت کڑھتا تھا۔ وہ جب عامر کو گانا سنتے یا گنگناتے دیکھتے تو اسے منع کرتے۔ مگر عامر ایک کان سے سنتا اور دوسرے سے نکال دیتا۔ اس نے اپنے کمرے میں فلمی اداکاروں کی تصویریں بھی لگا رکھی تھیں۔

ایک دن تو حد ہی ہو گئی۔ ادھر اذان ہو رہی تھی، ادھر عامر گانا سننے میں مصروف تھا۔ اس کے دادا سے رہا نہ گیا۔ وہ عامر کے کمرے میں داخل ہوئے۔ عامر نے انہیں دیکھتے ہی کیسٹ پلیئر بند کر دیا۔ دادا بولے "بیٹے کیا یہ درست ہے، جو تم کر رہے ہو۔ اذان ہو رہی ہے، مسلمانوں کو نماز کے لیے پکارا جا رہا ہے۔ اور تم کافروں کے بچھائے ہوئے جال میں پھنسے ہوئے ہو۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ جب یہ وطن آزاد ہوا تو لاکھوں مسلمانوں نے پاکستان کی طرف ہجرت کی۔ اس دوران میں جو مسلمان ہندوؤں کے ہاتھ آ جاتے وہ انہیں ختم کر دیتے اور آج تم انہی ہندوؤں کی تصویروں کو اپنے کمرے کی زینت بنائے ہوئے ہو۔ تم انہی کو سنتے اور دیکھتے ہو جو اب بھی کشمیر میں مسلمانوں پر بے پناہ ظلم ڈھا رہے ہیں۔ بیٹے، آپ کو یہ کام چھوڑ دینا چاہیے؟ اچھا اب میں جاتا ہوں۔ نماز کا وقت ہو رہا ہے" وہ اتنا کہہ کر کمرے سے نکل گئے۔

آج پہلی بار عامر کو احساس ہوا تھا۔ وہ اپنے کیے پر شرمندہ تھا۔ اس نے کمرے میں لگی تمام تصویریں اتار پھینکیں اور نماز پڑھنے مسجد کی طرف چل پڑا۔

اگلے دن موذن نے جیسے ہی صبح کی اذان کہی۔ عامر بستر سے اٹھ بیٹھا۔ اس نے وضو کیا اور نماز ادا کی۔ اس کے بعد قرآن پاک کی تلاوت کی۔ تمام گھر والے عامر کی اس تبدیلی پر حیران ہو رہے تھے۔ شام کے وقت دادا جان عامر کے کمرے کے سامنے سے گزرے تو انہوں نے دیکھا کہ عامر دیواروں پر کچھ لگا رہا ہے۔ انہوں نے غور سے دیکھا تو یہ پاکستان کا نقشہ تھا جس کے اندر "پاکستان کا مطلب کیا..... لا الہ الا اللہ" لکھا ہوا تھا۔

دادا عامر کی طرف بڑھے۔ عامر نے بھی انہیں دیکھ لیا تھا۔ دادا نے اپنے بازو پھیلا دیے۔ عامر ان کے سینے سے لگ گیا۔ (دوسرا انعام: 45 روپے کی کتابیں)

سوال یا تازیانہ

محمد اکبر رشید، کہروڑپکا

امریکا سے آئے ہوئے انکل نثار نے تمام بچوں کو اکٹھا کیا اور کہنے لگے "آج میں آپ سے ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں"۔

"انکل، کیا آپ کا سوال امریکا کے بارے میں ہوگا" احسن نے پوچھا۔

"بالکل نہیں، آج امریکا کی نہیں بلکہ صرف اور صرف پاکستان کی بات ہوگی" وہ سنجیدگی سے بولے۔

"پاکستان کی بات، ہم سمجھے نہیں" تمام بہن بھائی بیک وقت بول اٹھے۔

"میرا مطلب ہے کہ میرا سوال پاکستان سے متعلق ہوگا۔ تو پھر ہو جائے سوال" انکل نے سب کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"پوچھیں انکل، ماشاء اللہ ہم بقول شخصے کافی ذہین واقع ہوئے ہیں" آصف نے کالر جھاڑتے ہوئے خالی خولی ذہانت کا رعب ڈالنا چاہا۔

"سوچ لو، سوال بہت اہم ہے" انکل نے کہا۔

"آپ پوچھ کر تو دیکھیں انکل" ہم نے بھی اتراتے ہوئے کہا۔

"سوال پوچھنے سے پہلے میں ایک اعلان کرنا چاہتا ہوں" وہ مسکرا کر بولے۔

"جی، کیسا اعلان؟" ہم سب نے حیرت سے پوچھا۔

"بھئی انعام کا اعلان، یعنی جو میرے سوال کا بالکل درست جواب دے گا اسے ایک ہزار روپے انعام ملے گا"۔

انکل نے اعلان کیا تو ہماری آنکھوں میں بھی ایک عجیب سی چمک ابھر آئی۔ "کیا آپ سچ کہہ رہے ہیں کہ ایک ہزار روپے انعام دیں گے؟"

"ہاں بھئی سو فی صد درست کہہ رہا ہوں" وہ بولے۔

"کیا ہم بھی اس مقابلے میں شریک ہو سکتے ہیں؟" ابو امی نے ساری بات سننے کے بعد پوچھا۔

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے، آپ بھی جواب دے سکتے ہیں" انکل نے کہا۔

"لیکن ہمیں اعتراض ہے، اس طرح تو انعام ابو یا امی جیت جائیں گے" فرحت فوراً بول اٹھی۔

"مگر تم کیسے کہہ سکتی ہو" انکل نے پوچھا۔

"اس لیے کہ امی اور ابو کا مطالعہ کافی وسیع ہے، انہیں اس سوال کا جواب ضرور آتا ہوگا" عادل نے کہا۔

"نہیں ایسا نہیں ہوگا" انکل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یعنی آپ کا مطلب ہے کہ کوئی بھی اس سوال کا جواب نہیں دے سکے گا" نعمان بولا۔

"ایسا نہیں ہوگا۔ سوال بالکل آسان ہے اور ہے بھی عجیب و غریب۔ مگر اس کا جواب بہت ہی سادہ ہے" انکل نے کہا۔

"انکل، اگر سوال آسان ہے اور ہے بھی پاکستان سے متعلق تو پھر ہم جواب دے لیں گے۔ آخر ہم پاکستانی ہیں اور پاکستان کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں، آپ سوال پوچھیں، دیکھا جائے گا" میں نے کہا۔

"کیا آپ کو پاکستانی ہونے پر ناز ہے؟" انکل نے پوچھا۔

"جی، بالکل" سب نے ایک آواز ہو کر کہا۔

"تو پھر سوال غور سے سنیں" انکل کہنے لگے "یہ بتایئے کہ آپ کو پاکستان کی تہذیب و ثقافت سے محبت ہے یا غیر ملکی تہذیب و ثقافت سے؟"

"ارے یہ بھی کوئی سوال ہے؟ اس سے آسان سوال بھلا کیا ہو سکتا ہے۔ اس کا جواب دینا بھلا کون سا مشکل ہے" نعمان بولا۔

"تو پھر جواب دو ناں؟" انکل نے کہا۔

"ہمیں پاکستان سے محبت ہے" نعمان نے کہا۔

"باقی لوگ کیا کہتے ہیں؟" انکل نے سوالیہ نگاہوں سے سب کی طرف دیکھا۔

"پاکستان سے" سب نے بیک وقت جواب دیا۔ آخر میں انکل نے امی، ابو کی طرف دیکھا۔

"صاف ظاہر ہے، بھلا ہمیں پاکستان سے بڑھ کر کسی اور ملک اور اس کی تہذیب سے محبت کیوں کر ہوگی۔ مگر یہ بتائیں کہ کیا اب آپ ان سب کو ہزار ہزار روپے دیں گے؟" ابو نے حیرت سے پوچھا۔

"مگر وہ کیوں؟" انکل کے چہرے پر اب بھی مسکراہٹ تھی اور یہی بات ہمیں چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی کہ معاملہ کچھ اور

ہے۔

"بھئی سب نے درست جواب جو دیا ہے" امی بولیں۔

"مگر اس کی ضرورت ہی پیش نہیں آئے گی" انکل نے کہا۔

"مگر کیوں انکل؟" ہم نے احتجاج کیا۔

"اس لیے کہ آپ سب کا جواب غلط ہے" وہ بولے۔

"جی' کیا مطلب؟ یہ تو فاؤل ہے۔ انعام نہ دینے کا بہانہ ہے" سب چلا اٹھے۔

"نہیں بھئی یہ بہانہ نہیں' کیا واقعی آپ کو پاکستان سے محبت ہے؟" انہوں نے دوبارہ سوال دہرایا۔

"بالکل" ہم ایک آواز ہو کر بولے۔

"غلط" انکل بولے "تم کہتے تو ہو مگر اس کا کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکتے۔ میں نے ان سات دنوں میں دیکھا ہے کہ تمہیں پاکستان کی نسبت یورپ اور دوسرے غیر مسلم ممالک اور ان کی تہذیب اور ثقافت سے زیادہ محبت ہے۔۔ تم نے اپنا لباس دیکھا ہے۔ یہ سب انگریز قوم کا نہیں تو کیا ہے؟ مجھے دیکھو بارہ سال ہو گئے ہیں' امریکا میں رہتے ہوئے۔ میں تو اپنا مذہب' اپنی روایات اور کلچر نہیں بھولا۔ پاکستانی لباس پہنتا ہوں۔ پاکستانی چیزیں استعمال کرتا ہوں اور الحمدللہ امریکا میں رہ کر بھی پاکستانی ہوں اور تم لوگ..... ذرا اپنے گریبانوں میں جھانک کر دیکھو کہ کیا تم پاکستانی ہو؟" کتنے افسوس کی بات ہے' تمہارے امی' ابو بھی تمہیں نہیں سمجھاتے۔ مگر وہ کیسے سمجھائیں۔ وہ تو خود ہر چیز غیر ملکی خریدنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ اب آپ خود ہی فیصلہ کر کے بتائیں کہ آپ کو پاکستان سے محبت ہے یا..... اگر جواب یہ ہے کہ پاکستان سے محبت ہے تو تمہارا عمل ثابت نہیں کرتا اس بات کو' صرف زبانی دعویٰ کوئی ثبوت نہیں پاکستان سے محبت کا' اگر یہ کہتے ہو کہ ہمیں پاکستان سے محبت نہیں تو جواب ہو گیا غلط' اب خود ہی بتاؤ کہ میں ایک ہزار روپے کیسے پیش کروں؟" انکل نے کہا۔ ان کی آواز میں گہرے دکھ کا عنصر نمایاں تھا اور آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔ ہم سب بہن بھائی اور امی' ابو نے مارے شرمندگی کے سر جھکا لیے تھے۔ یہ سوال نہیں ہمارے لیے ایک تازیانہ تھا۔ (تیسرا انعام: 40 روپے کی کتابیں)

یہ ہے پاکستان

محمود الرحمان' لاہور

یہ واقعہ پچھلے دنوں پیش آیا۔ میرے ماموں جان دبئی سے آئے تھے۔ میں ان کے ساتھ اپنی نانی اماں سے ملنے گیا۔ ہماری نانی اماں ضلع شیخوپورہ کے ایک گاؤں "جوتکی" میں رہتی ہیں۔ ہم لاہور سے جوتکی ٹیکسی کے ذریعے گئے۔ راستے میں ٹیکسی خراب ہو گئی۔ اس لیے ہمیں گھر تک پیدل جانا پڑا۔ راستے میں بارش شروع ہو گئی۔ راستہ کچا اور بہت خراب تھا۔ ہمیں چلنے میں بہت دشواری ہو رہی تھی۔ میرے ماموں بار بار یہی کہتے "ہونہہ' یہ ہے پاکستان"

جب ہم اپنی نانی اماں کے گھر پہنچے تو ماموں جان تھکاوٹ سے چور تھے۔ انہوں نے زیادہ دیر بیٹھنا مناسب نہ سمجھا اور نہانے کے لیے چلے گئے۔ جب وہ نہا کر باہر نکلے تو انہوں نے اپنا سامان اکٹھا کیا۔ اچانک انہیں یاد آیا کہ ایک بیگ جس میں ضروری کاغذات تھے' ٹیکسی میں رہ گیا ہے۔ اب وہ بہت پریشان ہوئے اور کرسی پر بیٹھ کر کچھ سوچنے لگے۔ اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ باہر وہی ٹیکسی والا ہمارا بیگ لیے کھڑا تھا۔ میرے ماموں جان نے جب اسے دیکھا تو ان کی پریشانی فوراً غائب ہو گئی۔ اس نے کہا "بیگ پر آپ کے گھر کا پتا لکھا ہوا تھا۔ جسے پڑھ کر آگیا ہوں"۔

ماموں جان نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اسے خوشی خوشی رخصت کیا۔ جب وہ چلا گیا تو ماموں جان کے منہ سے بے اختیار نکلا "یہ واقعی پاکستان ہے"۔ (چوتھا انعام: 35 روپے کی کتابیں)

بلاعنوان

☆ اس کارٹون کا اچھا سا عنوان تجویز کیجئے اور 250 روپے کی کتابیں لیجئے۔ عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 7 مارچ

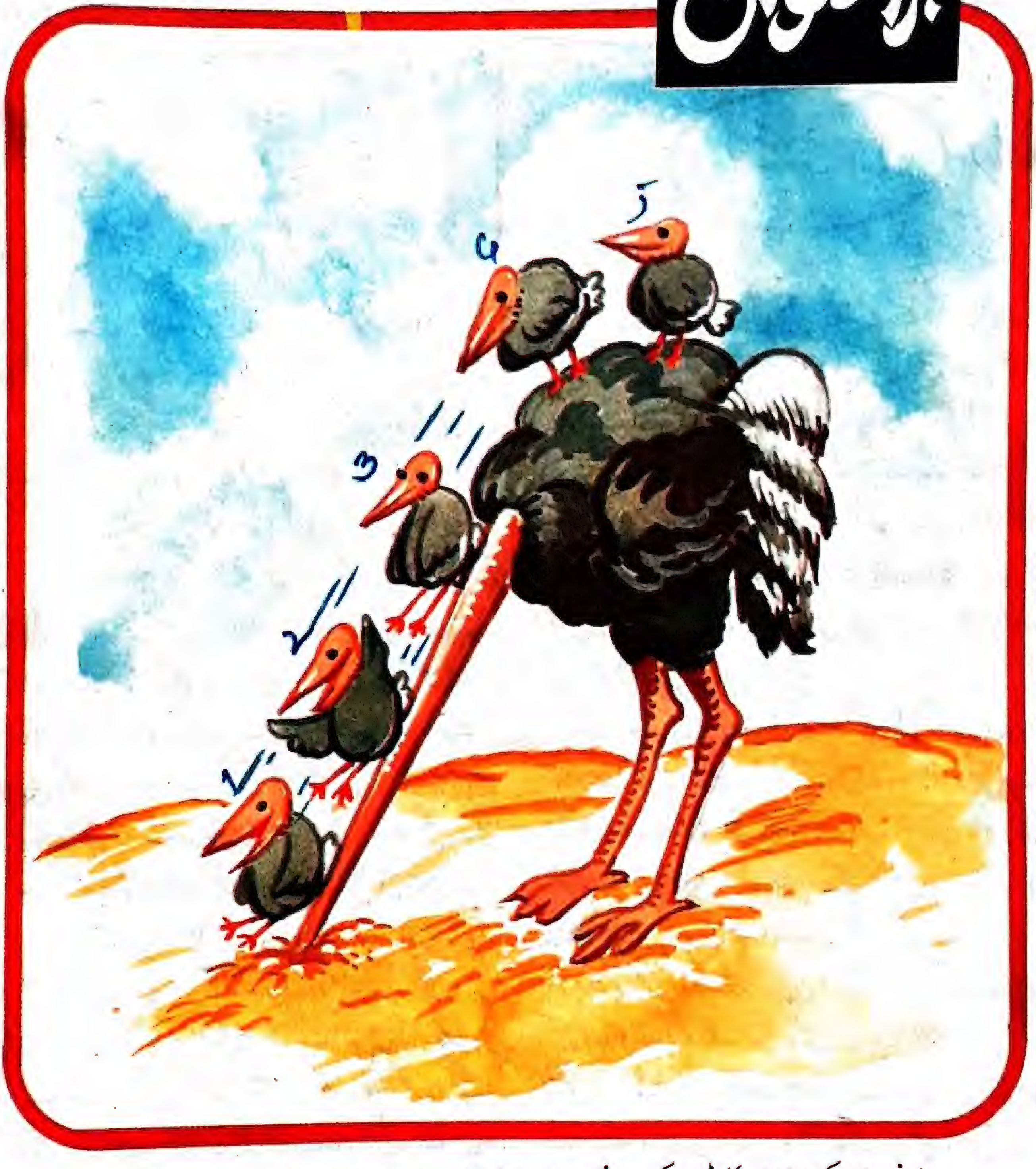

ماہ فروری کے بلاعنوان کارٹون کے بے شمار عنوان موصول ہوئے۔ ان میں سے جج صاحبان کو یہ تین عنوان: امّی، اب میری باری ہے' بڑے میاں سو بڑے میاں چھوٹے میاں سبحان اللہ' فیملی ٹیبل ٹینس' پسند آئے۔ جن ساتھیوں نے یہ نام تجویز کئے ان میں سے قرعہ اندازی کے ذریعے یہ تین ساتھی انعام کے حق دار قرار پائے۔

○ احتشام رشید' پشاور (امّی اب میری باری ہے۔ پہلا انعام: 100 روپے کی کتابیں)

○ سارہ جمیل' حیدر آباد چھاؤنی (بڑے میاں سو بڑے میاں' چھوٹے میاں سبحان اللہ۔ دوسرا انعام: 80 روپے کی کتابیں)

○ نوشین مشیر' لاہور (فیملی ٹیبل ٹینس۔ تیسرا انعام: 70 روپے کی کتابیں)

پاکستان کی پچاس ویں سال گرہ

1 رحمان اظہر، فیصل آباد (پہلا انعام: 100 روپے کی کتابیں)

2 محمد عثمان طیب، لاہور (دوسرا انعام: 75 روپے کی کتابیں)

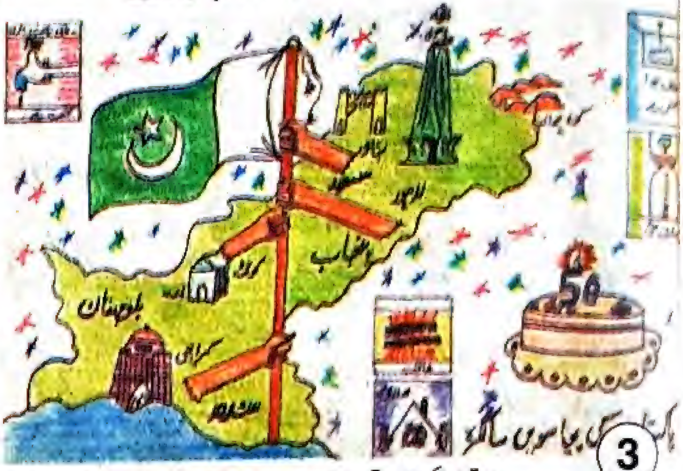

3 صبا اقبال، کراچی (تیسرا انعام: 50 روپے کی کتابیں)

4 سرور بشیر احمد، گوجرانوالہ (چوتھا انعام: 45 روپے کی کتابیں)

5 سید عمران ساجد، جھنگ صدر (پانچواں انعام: 40 روپے کی کتابیں)

6 محمد رضا، سرائے نورنگ (چھٹا انعام: 35 روپے کی کتابیں)

ہونہار مصوروں کی تصویریں بھی اچھی ہیں: محسن خان حویلیاں- محمد شکیل شیخوپورہ- کلیم اللہ خان اسلام آباد- محمد رضوان فیصل آباد- منال نیازی ل پنڈی- نادیہ تاج ملتان- سمیرا سلطان اسلام آباد- مدیحہ اشرف ملک لاہور- محمد قاسم لاہور- فرخندہ عباس لاہور- محمد اقبال جاوید چیمہ راول پنڈی- ب عباس لاہور- آسیہ تبسم بہاول پور- محمد شعیب لاچی- حسیب یوسف شیخوپورہ- قدسیہ عالم ملتان- نعمان حمید راول پنڈی- ثانیہ اسلم گوجرہ- روشن خٹک پشاور- عائشہ سیف فیصل آباد- سامیہ سلیم منڈی بہاء الدین- سارا فیض لاہور- نوید اشفاق لاہور- حسان خان لاہور- محمد قیس لقمان میاں ا- راجہ سمرہ ظریف شاہ پور صدر- سائرہ فاطمہ عبدالرؤف فیصل آباد- چودھری عبدالرحمان چاہل فیصل آباد-

اپریل کا موضوع: آئی بہار — آخری تاریخ 7 مارچ

مئی کا موضوع: محنت کش بچے — آخری تاریخ 7 اپریل

ہدایات: تصویر 6 انچ چوڑی، 9 انچ لمبی اور رنگین ہو- تصویر کی پشت پر مصور اپنا نام، عمر، کلاس اور پورا پتا لکھے اور اسکول کے پرنسپل یا ہیڈ مسٹریس سے تصدیق کروائے کہ تصویر اسی نے بنائی ہے-

تیسری قسط

روبن سن کروسو

ROBINSON CRUSOE

ڈینیل ڈیفو
ترجمہ: قمر نقوی

ہر فن مولا

میں نے سوچا، سال کو مختلف موسموں میں تقسیم کیا جائے۔ لہٰذا میں نے یہ تقسیم اپنی مرضی کے مطابق کی اور سال کو دو موسموں میں تقسیم کیا۔ ایک بارش کا موسم اور دوسرا خشکی کا موسم۔ وسط فروری سے وسط اپریل تک بارش کا موسم۔ وسط اپریل سے وسط اگست تک خشکی کا موسم۔ وسط اکتوبر سے وسط فروری تک پھر خشکی کا موسم۔

بارش کے دنوں میں مجھے بڑی تکلیف ہوتی تھی۔ گھر سے نکلنا دشوار ہو جاتا تھا۔ کئی دفعہ مجھے اس کا تجربہ ہوا۔ لہٰذا بارش سے پہلے ہی میں کھانے پینے کا ایسا انتظام کر لیتا کہ بارش میں باہر نہ نکلنا پڑے۔ لیکن یہ وقت میں ضائع نہیں کرتا تھا۔ میں نے بارش میں گھر کے اندر رہ کر بھی کام جاری رکھا اور درختوں کی نرم شاخوں سے ٹوکریاں بنانا شروع کر دیں۔

ایک روز میں کتے کو ساتھ لے کر گھومنے جا رہا تھا کہ اس نے دوڑ کر بکری کے ایک بچے کو پکڑ لیا۔ میں نے بچے کو کتے سے چھڑا لیا۔ میں بہت دنوں سے سوچ رہا تھا کہ بکریوں کو پالنا چاہئے۔ کیوں کہ ایک نہ ایک روز میرے پاس بارود ختم ہو جائے گی اور اس وقت میری پلی ہوئی بکریاں کھانے کے کام آئیں گی۔

میں اس بچے کو اپنے انگوروں کے باغ والے گھر میں لے آیا اور اسے ایک طرف باندھ دیا۔ چند ہی روز میں یہ بچہ مجھ سے بہت مانوس ہو گیا۔

میں نے چاول کاشت کیے تھے اور امید تھی کہ نومبر یا دسمبر میں فصل پک جائے گی۔ لیکن جب پودے بڑے ہوئے تو اچانک ان پر بکریوں اور خرگوشوں نے ہلا بول دیا۔ ان کو پودوں کی پتیاں بہت نرم اور میٹھی معلوم ہوئیں۔ یہ جانور دن رات فصل میں گھسے رہتے اور جب بھی پودے ذرا بڑھتے یہ ان کو کھا جاتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فصل بڑھنے سے رک گئی۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ کھیت کے چاروں طرف باڑ لگائی جائے۔ باڑ تیار کرنے میں مجھے بڑی مشکل پیش آئی۔ لیکن تین ہفتے کی محنت کے بعد میں نے یہ کام کر ہی ڈالا۔ اس کے بعد کوئی جانور دن کے وقت وہاں آتا تو میں اسے ہلاک کر دیتا۔ رات کے وقت میں کتے کو چھوڑ دیتا۔ وہ تمام رات بھونکتا

اور جانوروں کو نہ آنے دیتا۔ اس انتظام کے بعد فصل محفوظ ہوگئی اور بڑھنے لگی۔

کچھ عرصے کے بعد پودوں میں بالیاں آ گئیں۔ لیکن اب ایک اور مصیبت آئی۔ بالیاں پکنے لگیں تو ان پر چڑیوں نے حملہ کر دیا۔ اب جو میں نے دیکھا تو سارے کھیت میں بے شمار چڑیاں دانے کھا رہی تھیں۔ میں نے ان پر فائر کر کے تین چار کو گرا دیا۔ باقی اڑ گئیں۔ جو چڑیاں میں نے ماری تھیں ان کو وہیں لٹکا دیا تاکہ دوسری چڑیاں ڈر جائیں اور وہاں نہ آئیں۔ اس کا وہی نتیجہ ہوا جو میں چاہتا تھا۔ کوئی پرندہ بھی فصل کے پاس نہیں آیا۔ اب مجھے اطمینان ہو گیا۔ فصل تیار ہو رہی تھی۔ دسمبر کے آخر میں میں نے فصل کاٹ لی۔

بارش کے زمانے میں، جب کہ میں گھر میں رہتا تھا۔ میں نے مٹی کے برتن بھی بنا لیے تھے۔ لیکن مجھے چکنی مٹی کی تلاش رہی۔ اس مٹی سے میں مضبوط برتن بنانا چاہتا تھا۔ میں نے سوچا اگر مٹی کے اتنے بڑے برتن بنا لیے جائیں جن میں غلہ رکھا جا سکے تو بڑا اچھا ہو۔ خیر، میں نے بھاگ دوڑ کر کے مٹی جمع کر لی۔ لیکن مٹی کو گوندھنے کے لیے جو جتن مجھے کرنا پڑے، وہ میں ہی جانتا ہوں۔ اس مٹی سے میں نے بڑی بڑی کوٹھیاں (بھڑولے) بنانا شروع کیں۔ لیکن بہت سی بن بن کر ٹوٹ گئیں۔ اور بہت سی بن ہی نہ سکیں۔ بڑی محنت اور کوشش کے بعد بھی دو کوٹھیوں سے زیادہ نہ بنا سکا اور اس کام میں مجھے دو مہینے کا عرصہ لگ گیا۔

غلہ رکھنے کے لیے کوٹھیاں تو بن گئیں۔ مگر میرے پاس کوئی ایسا برتن نہیں تھا جس میں پانی وغیرہ رکھا جا سکتا۔

ایک بار میں کھانا پکانے کے بعد آگ بجھانے لگا تو آگ میں مجھے مٹی کا ایک ٹکڑا ملا۔ یہ ٹکڑا میرے بنائے ہوئے ایک برتن کا تھا جو ٹوٹ گیا تھا۔ یہ ٹکڑا آگ میں پک کر پتھر کی طرح سخت ہو گیا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی اور مجھے خیال آیا کہ اسی طرح برتن بھی بنا کر پکائے جا سکتے ہیں۔

اب میں نے یہ سوچنا شروع کیا کہ برتن کیسے پکائے جائیں۔ بھٹی بنانی تو مجھے آتی نہیں تھی۔ میں نے یہ کیا کہ کئی برتن تلے اوپر رکھے پھر ان کے چاروں طرف آگ جلا دی۔ آگ کی گرمی سے برتن لال ہو گئے۔ پانچ دس منٹ میں نے ان کو خوب پکنے دیا۔ اس کے بعد آگ ذرا کم کر دی۔ اس طرح میں ان برتنوں کو تمام رات آگ میں پکاتا رہا۔ صبح تک برتن خوب مضبوط ہو گئے۔ اس کے بعد تو میں نے بے شمار برتن بنا ڈالے۔ ان کی شکل اچھی نہیں تھی۔ لیکن یہ تھے کارآمد۔

تیسرے سال میرے غلے کی مقدار اتنی بڑھ گئی کہ مجھے زیادہ کوٹھیوں کی ضرورت پیش آئی۔ اب غلہ اتنا تھا کہ میں خوب فراغت کے ساتھ کھا سکتا تھا۔ بہت دنوں تک تو میں نے روٹی کھائی ہی نہیں۔ صرف گوشت اور پھلوں پر گزارہ کرتا رہا۔ غلہ جمع ہو گیا تو میں نے اپنی خوراک میں روٹی بھی شامل کر لی۔

ایک دن مجھے خیال آیا کہ میں سمندر میں دور تک جاؤں۔ ممکن ہے کوئی جہاز نظر آ جائے۔ لیکن میرے پاس نہ کشتی تھی نہ جہاز۔ جہاز تو کب کا تباہ ہو چکا تھا۔ وہ کشتی البتہ ساحل پر پڑی تھی جس پر ہم جہاز سے اتر کر چلے تھے اور جس کو ایک بڑی لہر نے تباہ کر دیا تھا۔ لیکن یہ کشتی الٹی پڑی تھی اور میں تنہا اسے سیدھا نہیں کر سکتا تھا۔

آخر میں نے کشتی بنانے کا فیصلہ کیا۔ میرے پاس اس کام کے لیے اوزار نہیں تھے۔ لیکن میں جانتا تھا کہ جنگلی لوگ درخت کے تنے کو بیچ میں سے کھوکھلا کر لیتے ہیں اور اس کو کشتی کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ میں نے ایک موٹے درخت کو کاٹ کر گرایا۔ اس کا قطر 5 فٹ تھا اور لمبائی 22 فٹ۔ اس درخت کو گرانے میں 29 روز اور اس کی شاخیں الگ کرنے میں 14 روز لگے۔ اب ایک بہت بڑا

شہتیر میرے سامنے تھا جس کو کشتی کی صورت میں ڈالا جا سکتا تھا۔ اس قسم کی کشتی کو کینو کہتے ہیں۔

اب اس تنے کو ایک طرف سے کھوکھلا کرنا تھا۔ یہ بڑا تھکا دینے والا کام تھا۔ لیکن تین مہینے کی محنت کے بعد آخر میں نے یہ کام بھی کر لیا اور ایک عمدہ کشتی بن گئی۔ دوسرا مرحلہ اس کشتی کو پانی میں ڈالنے کا تھا۔ میں نے اپنا سارا زور لگا دیا کہ اس کو حرکت دے سکوں لیکن مجھ سے یہ نہ ہو سکا۔ اس وقت مجھے جس قدر سخت صدمہ ہوا، اس کا اندازہ ممکن نہیں۔ کام شروع کرنے سے پہلے میں نے اس بات کا خیال ہی نہیں کیا تھا کہ اس کو پانی تک کیسے لے جاؤں گا۔ جب میں کسی طرح کشتی کو حرکت نہ دے سکا تو میں نے اس کا خیال چھوڑ دیا۔

میرے پاس کچھ کپڑے تھے۔ اس کے علاوہ میں نے جو جانور اب تک مارے تھے، ان کی کھالیں بھی خشک کر کے رکھ لی تھیں۔ کھالیں بہت اچھی تھیں۔ اور ان سے بہت سے کام لیے جا سکتے تھے۔ میں ان سے استعمال کی چیزیں بنانا چاہتا تھا۔ سب سے پہلے میں نے کھال کی ٹوپی بنائی۔ یہ کام میں نے اس خوبی سے کیا کہ اس سے میری ہمت بڑھ گئی اور میں نے اپنے لیے کھال کا ایک سوٹ تیار کر لیا۔ اس کے بعد میں نے کھال ہی کی ایک چھتری بنالی، جو مجھے بارش سے محفوظ رکھتی تھی۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اب اسی جزیرے پر زندگی گزارنا ہے۔ اس لیے میرا دل نہیں گھبراتا تھا۔ اس عرصے میں کوئی ایسا خاص واقعہ بھی نہیں ہوا۔ میں ہر سال مناسب وقت پر چاول اور جو کاشت کرتا اور پورے سال کے کھانے کا انتظام کر لیتا۔ انگور کے موسم میں انگور خشک کر کے کِش مِش بنا لیتا۔

مجھے ہر قسم کی خوشی اور اطمینان میسر تھا۔ دکھ تھا تو صرف اس بات کا کہ میں تنہا تھا اور یہ تنہائی مجھے کاٹنے کو دوڑتی تھی۔ (باقی آئندہ)

حفیظ الرحمٰن احسن

نام ہے میرا پاکستان

کل بچّہ تھا، آج ہوں بُوڑھا، لیکن پھر بھی مَیں ہُوں جوان
عُمر ہے میری نِصف صدی، اور نام ہے میرا پاکستان
ہے بُنیاد مری توحید پہ، اور اِسلام مری پہچان
چاند ستارے کا پرچم ہے میری عظمت کا عُنوان
مِلّت پر قربان ہوں مَیں، اور مِلّت ہے مجھ پر قُربان

اپنی پیدائش سے اب تک کتنے ہی دُکھ جھیلے ہیں
ہر جانب ہے پھر بھی رونق، اور خُوشیوں کے میلے ہیں
میری گود میں، آتے جاتے کتنے موسم کھیلے ہیں
اونچے پربت اور میدان ہیں، دریاؤں کے ریلے ہیں
میری دھرتی پر سب خوش ہیں، بچّے، بُوڑھے اور جوان

سب سے انوکھا ہُوں مَیں جگ میں، میری شان نرالی ہے
میرے باغوں میں رونق ہے، خوش اُن کا ہر مالی ہے
میرے مزدُوروں نے اپنی ہر عظمت منوالی ہے
اور کسانوں کی محنت سے ہر جانب ہریالی ہے
ہر نعمت ہے مجھ کو حاصل، اللہ کا ہے خاص احسان

عہد کرو یہ سچّے دل سے، میرا مان بڑھاؤ گے
میرے چپّے چپّے پر خُوشیوں کے پھول کھلاؤ گے
علم کی شمعیں روشن کر کے ذہنوں کو چمکاؤ گے
میری عظمت کا پرچم سب دنیا پر لہراؤ گے
پُورا کرنا ہوگا تم کو، مجھ سے جو باندھو پیمان،
مُستقبِل ہو روشن میرا، اور پُورے ہوں سب ارمان!

قائدِ اعظم

محمد علی جناح

قائداعظم محمد علی جناحؒ کے آباؤاجداد کاٹھیاواڑ کی ریاست گونڈل کے ایک چھوٹے سے گاؤں پانیلی کے رہنے والے تھے اور کپڑے کا کاروبار کرتے تھے۔ قائداعظمؒ کے والد ماجد جینا بھائی پونجا اپنے سب بھائیوں سے چھوٹے تھے۔ لیکن انتہائی ذہین، حوصلہ مند اور جفاکش انسان تھے۔ وہ کاروبار کے سلسلے میں اپنے گاؤں سے پہلے گونڈل اور پھر آگے قدم بڑھاتے ہوئے مشہور تجارتی شہر، کراچی میں پہنچ گئے۔ یہاں کھارادر میں رہائش اختیار کر لی۔ 25 دسمبر 1876ء کو ان کے ہاں ایک بچہ پیدا ہوا جس نے لگن، مستقل مزاجی اور مسلسل جدوجہد کے ذریعے دنیا میں ایک نئی اسلامی سلطنت قائم کر دی۔ یہ بچہ قائداعظم محمد علی جناح تھا۔

قائداعظمؒ کو اپنی منزل تک پہنچنے کے لئے ہر قدم پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ مخالفت کے طوفانوں نے ان کا راستہ روکنے کی کوشش کی۔ انہیں اپنے ارادے سے باز رکھنے کے لیے طرح طرح کے لالچ دیئے گئے۔ لیکن اس مرد مجاہد کے قدم کبھی نہ ڈگمگائے۔ وہ تمام رکاوٹوں کو روندتے ہوئے اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہے۔

آخر اپنی جہد مسلسل سے قائداعظمؒ نے مسلمانان ہند کو اپنی منزل، قیام پاکستان سے ہم کنار کر دیا۔ ان کا یہ عظیم کارنامہ دنیا کی تاریخ میں ہمیشہ سنہری حرفوں میں محفوظ رہے گا۔

پیارے بچو، قائداعظمؒ کے حالات زندگی میں آپ کے لیے بھی ایک اہم سبق موجود ہے کہ:

حالات کتنے ہی ناساز گار کیوں نہ ہوں انسان کو کبھی ہمت نہیں ہارنی چاہیے۔ زندگی میں کامیابی کا راز مسلسل جدوجہد اور مستقل مزاجی میں ہی مضمر ہے۔

25 دسمبر 1876ء

صدیوں پہلے کی بات ہے کہ 25 دسمبر کے دن حضرت عیسیٰؑ پیدا ہوئے۔ 1876ء میں عین اسی روز کراچی کے وزیر مینشن میں رہنے والے ایک تاجر جناح بھائی پونجا کے ہاں ایک ننھا منا ہونہار پیدا ہوا۔ اس روز شہر کی عیسائی آبادی کرسمس کا تہوار منا رہی تھی اور سارا شہر مسرتوں سے مہک رہا تھا۔

اس وقت کسے معلوم تھا کہ یہی ہونہار بڑا ہو کر ایک بے مثال راہ نما بنے گا اور ایک نئی اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھ کر مسلمانوں کی کایا پلٹ دے گا۔

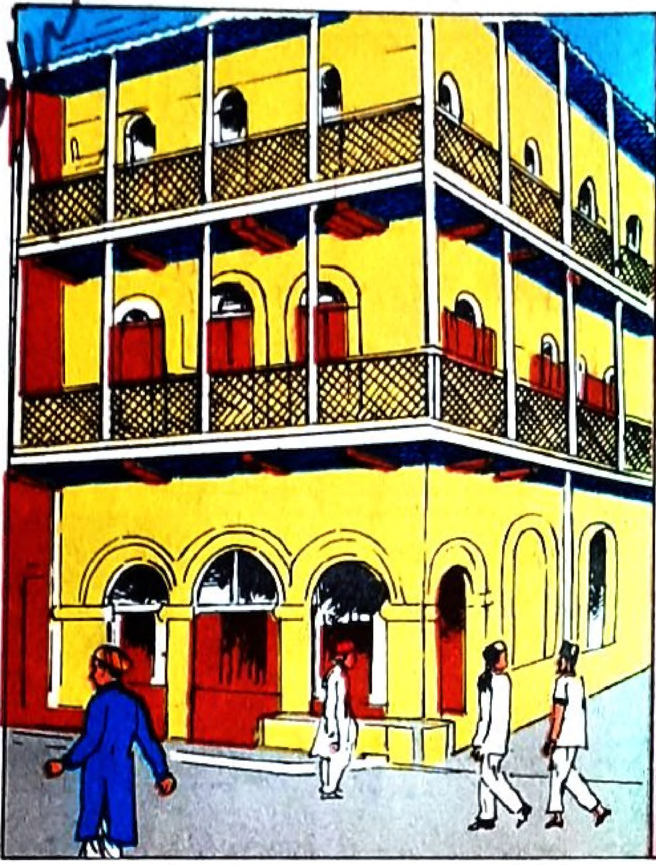

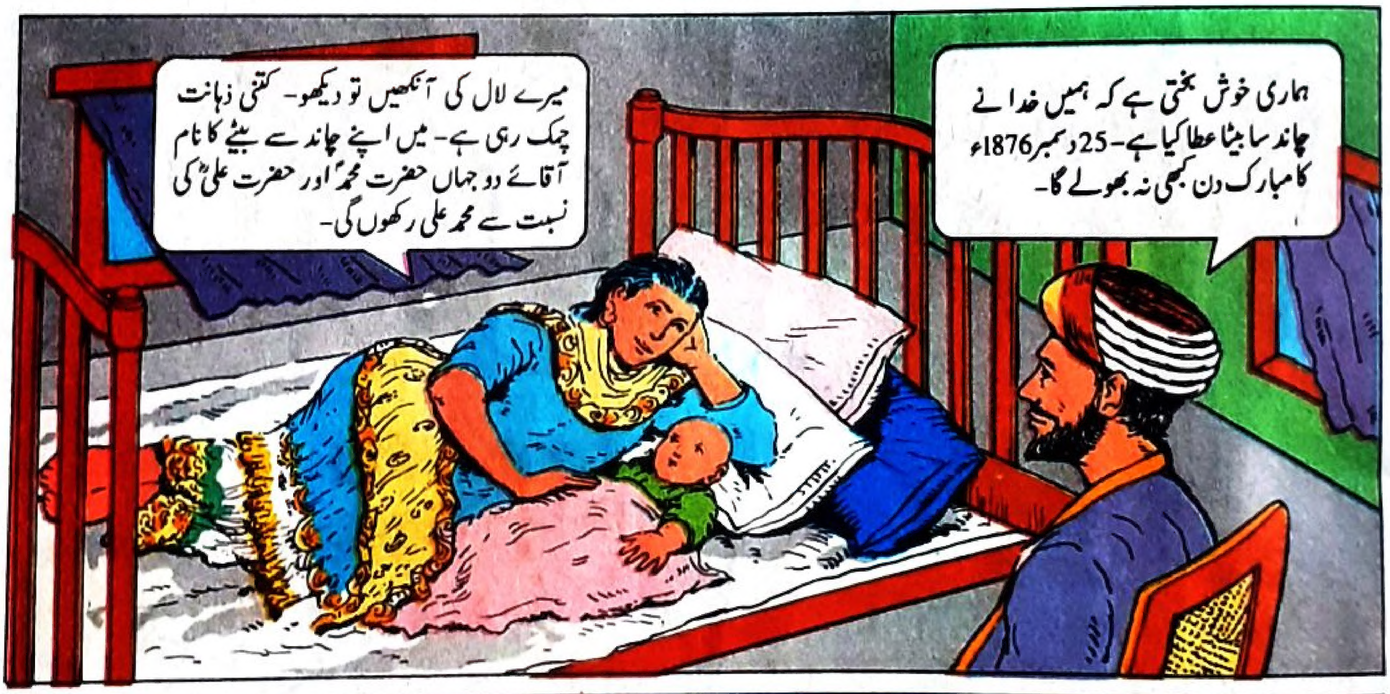

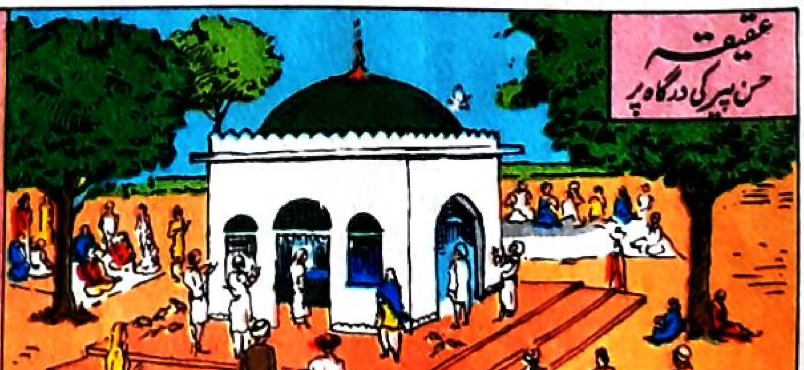

محمد علی کی والدہ مٹھی بائی کو بزرگان دین سے نہایت عقیدت تھی۔ اس لیے ان کی خواہش پر نومولود کے عقیقہ کی رسم ان کے آبائی وطن کے ایک مشہور بزرگ حسن پیر کی درگاہ پر ادا کی گئی۔

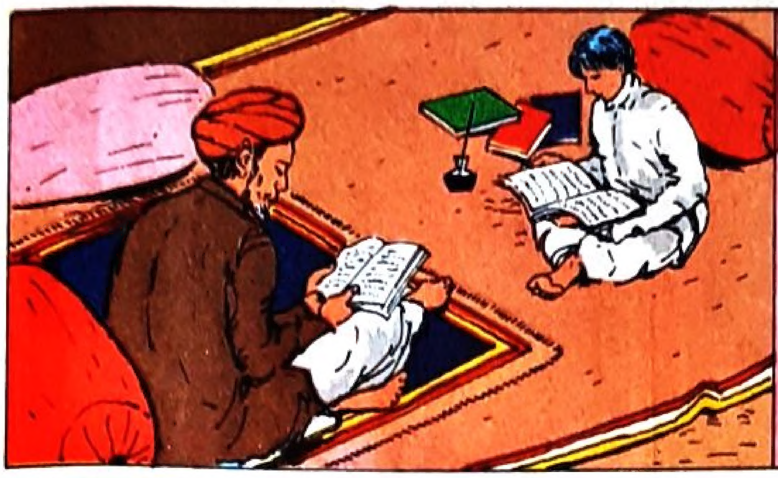

ابتدائی تعلیم

محمد علی چھ سات برس کے ہوئے تو ماں باپ کو ان کی تعلیم کی فکر لاحق ہوئی۔ چوں کہ نزدیکی علاقے میں کوئی اسکول موجود نہیں تھا۔ اس لیے بچے کی ابتدائی تعلیم کا اہتمام گھر پر ہی کر دیا گیا۔ ایک معلم کی خدمات حاصل کی گئیں جو انہیں ان کی مادری زبان، گجراتی میں تعلیم دیتا تھا۔

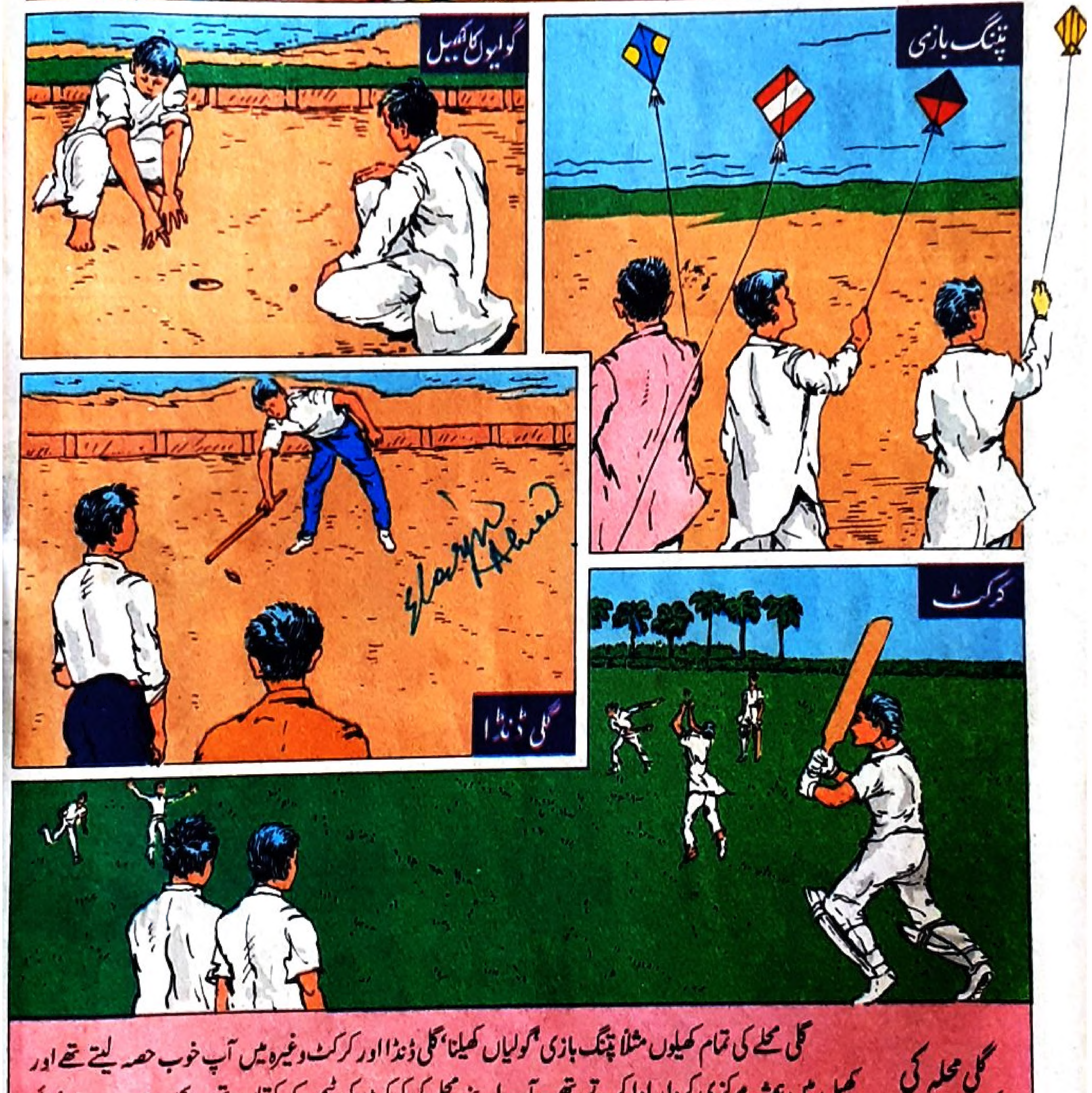

گلی محلہ کی کھیلیں

گلی محلے کی تمام کھیلوں مثلاً پتنگ بازی، گولیاں کھیلنا، گلی ڈنڈا اور کرکٹ وغیرہ میں آپ خوب حصہ لیتے تھے اور کھیل میں ہمیشہ مرکزی کردار ادا کرتے تھے۔ آپ اپنے محلے کی کرکٹ کی ٹیم کے کپتان تھے۔ بچپن ہی سے راہ نمائی اور قیادت کا جذبہ اور رجحان آپ میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔

The Taleem-o-Tarbiat, Lahore
NO.4756 PAKISTAN'S MOST WIDELY READ URDU MAGAZINE FOR CHILDREN OF ALL AGES Price Rs. 15.00

Sharjeel Ahmed

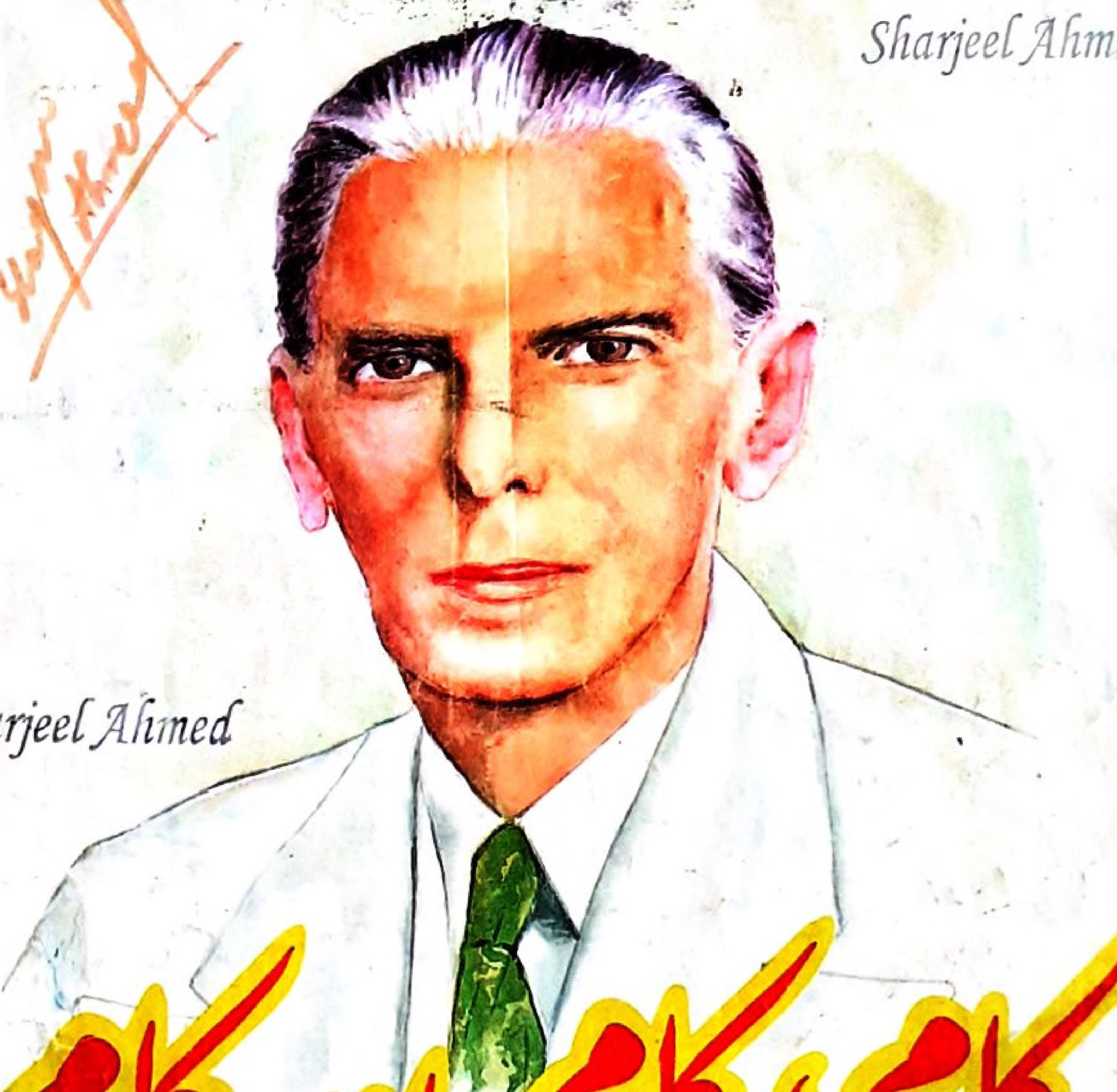

Sharjeel Ahmed

کام، کام اور کام

WORK, WORK AND WORK

AND DON'T FORGET OUR MOTTO: UNITY, DISCIPLINE AND FAITH

محنتِ شاقہ، مسلسل تگ و دَو اور استقلال وہ خصوصیات ہیں جو نوجوانوں کے لیے مستقبل میں مشعلِ راہ ہونی چاہئیں۔

M.A. Jinnah

قائدِ اعظمؒ